اَلَآ اِنَّ فِیْ الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ ﴿بخاری﴾

''معلوم ہونا چاہیے کہ جسمِ انسانی میں خون کا ایک مضغہ' گوشت ہے جب وہ ٹھیک ہوتو سارا جسم ٹھیک رہتا ہے اور جب اس میں بگاڑ آ جائے تو پورے انسانی وجود میں بگاڑ آ جاتا ہے اور وہ قلب ہے''

اس قلبی بگاڑ اور اندرونی خباثت کی اصلاح سلوک میں موجود ہے۔

فرمایا: راولپنڈی کی جامع مسجد کے ایک خطیب صاحب مدینہ منورہ گئے اور تصفیہ قلب کے لئے دعا مانگی۔ انہوں نے خواب دیکھا کہ ''صاف شفاف پانی لینا چاہیے''۔ واپسی پر میرے پاس حاضر ہوئے اور اپنا خواب بیان کر کے تعبیر پوچھی۔ میں نے کہا کہ دو چیزیں ہوتی ہیں آگ اور پانی۔ آگ کی خاصیت یہ ہے کہ اس کی تپش یا گرمی پر جو چیز چاہو پکا لو مگر جو چیز اس کے اندر ڈالو گے پک جائے گی یا وہ جل جائے گی۔ لیکن صاف پانی تب ہی لیا جا سکتا ہے جبکہ برتن اچھی طرح صاف وشفاف ہو۔ اگر برتن میں ذرہ بھر بھی میل یا گندگی ہوگی تو صاف وشفاف پانی بھی گدلا ہو جائے گا اور صاف نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح طریقت کا اصول ہے کہ آدمی اپنے ظرف باطنی (یعنی قلب) کو ہر طرح اور ہر پہلو سے صاف کر کے پیرِ طریقت کے پاس جائے اور پیرِ طریقت کے احکام پر کار بند ہو اور اخلاص سے انہیں پورا کرے اور ان پر کار بند ہو جائے تب حصولِ مقصد ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ قلب کی جب تک صفائی نہ کی جائے علومِ حقائق اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔

فرمایا: صفائی قلب سے ہماری مراد اپنے قلب کو خیالات ماسویٰ اللہ سے صاف کرنا ہے۔ ورنہ انگریزوں میں بھی بعض لوگ ایسے ہیں جو چند مخصوص مشقوں کی وجہ سے کسی حد تک دل کی صفائی کے باعث دوسروں کے دل کی بات جان لیتے ہیں اور یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ کسی شخص کی جیب میں کتنے پیسے ہیں۔ سینکڑوں میل دور کا حال بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ خارق عادت باتیں بھی کرتے ہیں حالانکہ وہ کافر ہیں۔ کیا ہم انہیں ولی کہیں گے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ صرف ان کے خیال کا کنٹرول اور ان کی ذاتی کوشش وریاضت کا نتیجہ ہے۔ اسے استدراج کہتے ہیں۔ اس میں تمام غیر مسلم شامل ہیں خواہ عیسائی ہوں یا یہودی، بدھ ہوں یا ہندو وغیرہ۔ اس کو وہ اپنے خیال میں روحانیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ محض ارتکازِ توجہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ ذاتی توجہ کو مرتکز کر کے اپنی قوت ارادی کو مضبوط کر لیتے ہیں اور مسمریزم، ہپناٹزم، سپیریچولزم وغیرہ کے شعبدے دکھاتے ہیں۔ یہ اصل میں صفائی قلب نہیں ہے بلکہ ارتکازِ توجہ کا عمل ہے جو سعی وکوشش سے انسان کو حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ سب کسبی چیزیں ہیں۔ ان کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ان کا کوئی اُخروی ثمرہ ہے۔ یہ محض شعبدہ بازی ہے۔

فرمایا: تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب قربِ الٰہی حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں اور اسی سے حضور سرورِ کائنات ﷺ پر پختہ ایمان اور ان کی غلامی سے نورانیت اور روحانیت پیدا ہوتی ہے۔

فرمایا: ایک شخص حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کی خدمت میں پیش ہوا اور وہیں رہ کر خدمت میں مصروف ہو گیا۔ کافی عرصہ کے بعد کسی نے حضرتؒ کے ہاں اس کی سفارش کی کہ اس کی خدمت قبول فرمائی جائے۔ تو آپؒ نے جواباً فرمایا کہ میں اس کی خدمت قبول نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے اس کی پیشانی پر کچھ اور ہی لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی پیشانی پر شقی لکھا ہے۔ کسی نے اس بات کی اطلاع اسے بھی کر دی کہ تیری خدمت تو حضرت کو منظور نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ میری خدمت قبول ہو یا نہ ہو مجھے اس سے سروکار نہیں۔ میں تو آپؒ کو اللہ کا برگزیدہ بندہ سمجھ کر اللہ ہی کے لئے خدمت کر رہا ہوں اور خدا دیکھ رہا ہے۔ وہ کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے چلا گیا۔

سالِ آئندہ جب حضرت خرقانیؒ حج بیت اللہ شریف کے لئے تشریف لے گئے تو طواف کرتے وقت اس شخص کو بھی دیکھا اور اس کی پیشانی پر وہ اندراج نہ پایا۔ حیران ہو کر پوچھا کہ پہلے تیری حالت بضد تھی اب حج بیت اللہ اور طواف کعبہ کے علاوہ تجھ میں اس قدر روحانیت بھی موجود ہے یہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ طاقت مجھ میں پہلے بھی تھی فقط ایک چیز کا منکر تھا وہ یہ کہ میں حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا منکر تھا۔ جب آپ نے میری خدمت قبول نہ فرمائی تو میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس وقت میرے دل نے گواہی دی کہ میں غلط راستہ پر ہوں۔ لہٰذا ہوش آنے پر میں نے کلمہ طیبہ **لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ** ﷺ دل سے پڑھا اور حضور پاک ﷺ کا سچا خادم بن گیا۔ یہ تسلیم کرنے کے ساتھ ہی مجھ پر سب کچھ ظاہر ہوا اور اِس درجہ پر فائز ہوا۔ ثابت ہوا کہ علم اور یہ باطنی قوت اس میں پہلے سے تھی لیکن صحیح ایمان لانے کے بعد اس کی صفائی قلب ہوئی اور اس کے ساتھ ہی روحانی ترقی بھی ہو گئی۔

قلب کا جاری ہونا

فرمایا: بعض صوفیوں میں یہ مشہور ہے کہ فلاں صوفی کا قلب جاری ہے اور اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خواہ اس کا خیال ہو یا نہ ہو قلب ذکر میں مشغول رہتا ہے۔ یہ درست نہیں کیونکہ انسان کے افعال دو قسم ہیں۔ ایک اختیاری اور دوسرا غیر اختیاری۔ مراتب کا انحصار اختیاری فعل پر ہے کیونکہ اختیاری فعل میں ماسویٰ اللہ سے بے نیاز ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو کر ذکر کرتا ہے لیکن غیر اختیاری میں انسان کی توجہ نہ دل کی طرف ہوتی ہے نہ اللہ کی طرف اور نہ ہی ذکر کی طرف۔ جب انسان کو پتہ ہی نہ ہو کہ ذکر کر رہا ہے تو اس میں ثمرات کیسے مرتب ہوں گے۔ اگر یہ بات باعثِ ترقی ہو تو وہ لوگ جن کو اختلاجِ قلب کا مرض لاحق ہو جاتا ہے جسے انگریزی میں (Heart Palpitation) کہتے

ہیں وہ تو درجہ کمال کے ولی ہوں گے۔ لیکن اس وجہ سے ایسا نہیں ہوتا۔ موٹر چلانے والا جب تک بااختیار رہ کر موٹر چلاتا ہے تو جائے مقصود تک پہنچ جاتا ہے اور اگر ذرا سی بھی غفلت ڈرائیور سے ہو جائے تو موٹر کسی درخت یا دیوار وغیرہ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے اور سواریوں کی بھی خیر نہیں رہتی۔ پس سمجھنا چاہیے کہ فعل اختیاری اور غیر اختیاری میں کتنا فرق ہے۔ فعل اختیاری پر ثمرہ ملتا ہے اور فعل غیر اختیاری باعث خسران ونقصان ہے۔

انسانی نفس اور تزکیہ ٔ نفس

فرمایا: انسان کا وجود مختلف اور متضاد عناصر کا مرکب ہے۔ اس کے خمیر میں حیوانیت، بہیمیت اور ملکیت یہ سب کچھ گندھا ہوا ہے اور یہ نفس انسانی میں متقفل ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا o فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ﴿الشمس:8-7﴾

''نفس انسانی کو اور اس کے اعضا کو برابر کیا اور اس کو بدکاری سے بچنے اور پرہیزگاری اختیار کرنے کی سمجھ دی''

فرمایا: قرآن کریم میں نفس انسانی کی تین قسمیں گنوائی گئی ہیں:

1۔ **نفس امّارہ** : جو انسان کو برائیوں پر اکساتا ہے اور تائب ہونے سے روکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوْٓءِ ﴿یوسف:53﴾

''بے شک نفس (امّارہ) تو برائی ہی سکھاتا رہتا ہے''

2۔ **نفس لوّامہ**: جو انسان کو غلطیوں اور گناہوں پر ملامت کرتا ہے۔ اس کو ضمیر بھی کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ﴿القیٰمة: 2﴾

''اور قسم کھاتا ہوں ایسے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے''

3۔ **نفس مطمئنہ** : جو صحیح راہ پر چلنے اور غلط راہ چھوڑ دینے پر اطمینان محسوس کرتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ o ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿الفجر::28-27﴾

''اے نفس مطمئنہ تو اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل۔ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی''

نفس امّارہ دنیاوی لذات کا شیدائی ہے۔نفسانی خواہشات کو پیدا کرتا رہتا ہے۔جھوٹی شان، نام ونمود اور جھوٹی سماجی حیثیت کو قائم رکھنے کے لئے اپنی آمدنی کے ناجائز ذرائع اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔حرام وحلال میں کوئی فرق نہیں رہنے دیتا۔اصل میں بے جا خواہشاتِ نفس ہی انسان کو صراط مستقیم سے بھٹکاتی ہیں۔جیسا کہ قرآن کریم میں وارد ہوا:

فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَکَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا یَتَّبِعُوْنَ اَھْوَآءَ ھُمْ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ ھَوٰهُ بِغَیْرِ ھُدًی مِّنَ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴿القصص:50﴾

''پھر اگر یہ تمہاری بات قبول نہ کریں تو جان لو کہ یہ صرف اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔اور اس سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے پیچھے چلے۔بے شک خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا''

فرمایا: نفس پر قابو پانا سب سے مقدم ہے۔انسان خود مختار نہیں کہ جو کچھ چاہے کرتا رہے بلکہ اس کا ایک مولا ہے جس نے اس کو اوامر ونواہی کا مکلّف بنایا ہے اور جس کے آگے اس نے ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہے۔

فرمایا: صوفی کے لئے ضروری ہے کہ اپنی بے جا خواہشاتِ نفس کو قابو میں رکھے اور خود احتسابی کرتا رہے۔یہ جو عموماً کہا جاتا ہے کہ اپنے نفس کو مار لینا چاہیے یہ صحیح نہیں اور یہ خلافِ فطرتِ انسانی ہے۔مدعا یہ ہے کہ وہ اپنی بُری خواہشات کو قابو میں رکھے اور اپنے نفس کو اتنا مغلوب کرلے کہ وہ کبھی غالب نہ ہوسکیں۔

فرمایا: نفسِ امّارہ پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے اپنے شیخ کامل کی توجہ اور رہنمائی کی اشد ضرورت ہے۔اسی کی ہدایات کے مطابق ریاضت اور مجاہدہ کیا جائے۔جب ریاضت ومجاہدہ سے نفس اس پستی سے ابھرنا شروع ہوتا ہے تو اسے اپنی ضلالت وگمراہی کا احساس ہوتا ہے تو وہ معصیت سے بچتا ہے اور معصیت پر ملامت کا اظہار کرتا ہے۔اُس وقت اسے نفس لوّامہ کہتے ہیں۔

جب شیخ کی توجہ سے یہ ملکہ اس میں راسخ ہوجاتا ہے اور ملکیت بشریت پر غالب آجاتی ہے تو وہ مراتب اعلیٰ پر پہنچ جاتا ہے تو اسے نفس مطمئنہ حاصل ہوجاتا ہے۔یہی وہ مقام ہے جہاں اسے مقصد حیات یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا o وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا ﴿الشمس: 10-9﴾

''وہی بندہ کامیاب وبامراد ہوا جس نے اپنے نفس کی اصلاح کی اور اس کو سدھارا اور وہ نامراد ہوا جس نے اسے خاک آلود کیا''

فرمایا: انسان کے پورے نظام زندگی اور پورے معاشرہ اور تمدن کی کامیابی کا انحصار تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب حاصل کرنے میں ہے اگر ایسا نہ ہوتو اس کا سارا نظام مختل اور معطل ہو جاتا ہے پھر خارجی اسباب اور سازوسامان کچھ کام نہیں آتا۔انسان کی انفرادی اور اجتماعی کامیاب زندگی کا انحصار اس کی قلبی اصلاح اور تزکیہ نفس کی بنیاد پر ہے۔آج زندگی کا سارا فساد اور سارا انتشار انسان کی اسی اندرونی کثافت اور ظلمت کا نتیجہ ہے۔

اسی لئے سب سے پہلے انسان کو مجاہدۂ نفس کے ذریعہ تزکیہ نفس اور قلبی اصلاح کا انتظام کرنا چاہیے اور اپنے اخلاق اور معاملات کو درست کرے۔نفس کی اصلاح کرنے کے بغیر نہ انسان میں اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی ایثار و قربانی اور باہمی محبت واتحاد کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔

فرمایا: علمائے ملتان نے سوال کیا کہ تزکیہ نفس اور روحانی ارتقاء اطمینان قلب اور مالک حقیقی کی معرفت حاصل کرنے کیلئے کیا طریقے و ذرائع ہیں جن کو بروئے کار لاکر انسان بدی سے نفرت اور نیکی سے طبعاً محبت کرنے لگتا ہے۔ان کے سوال کا مختصر یہ جواب دیا گیا۔

''چونکہ کسی امر کے سمجھنے کے لئے اس امر کی وقعت کے موافق سمجھ کا ہونا شرط ہے اور سمجھ بھی بصیرت قرآنی سے ہونی ضروری ہے۔ واضح ہو کہ اطاعت اور محبت ذاتی کے ماتحت مخالفت نفس میں کامیاب ہونا تزکیہ نفس ہے اور تزکیہ نفس سے روح کو یہ حکومت (جو انسان کو اپنی حقیقت کی طرف متوجہ کرے) حاصل ہوتی ہے اور یہی اطمینان کا ذریعہ ہے مگر کلی اطمینان ظلمانیت مفقود ہوکر مشاہدہ کی صورت سے ہوسکتا ہے۔اس کے بعد معرفتِ الٰہی کا درجہ ہے۔اس اجمالی کیفیت کی تفصیل کے لئے ایک ضخیم کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔الغرض طالبِ حال صاحبِ حال سے از روئے حال استفاضہ کرتا ہے اور اس کا معیار وہی ضیائے ربانی ہے جو حضور سرور کائنات ﷺ کے سینہ اقدس میں جلوہ گر ہے اور اس کا ثبوت بھی اسی دستور العمل ظاہر و باطن کی تکمیل ہے مگر ایسے لوگ نادر الوجود ہیں۔ملمع اور تصنع بہت موجود ہیں۔ **نعوذ باللہ من ذالک**''

معرفتِ الٰہی (خداشناسی) اور معرفتِ نفس (خودشناسی)

فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ذات کی معرفت حاصل نہیں ہوسکتی۔ وہ قدیم، وہ خالق، وہ غیر محدود، وراء الورا، ثم وراء الورا ہے۔اس لئے وہ حادث، مخلوق اور محدود کے حصر میں کیسے آسکتا ہے؟ اور اس کی ذات کی معرفت اسے کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟ وہ تو ہر وہم و گمان سے بالاتر و اعلیٰ ہے۔قرآن پاک میں آیا ہے۔ **لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْئٌ** یعنی اس کی مثال کی مثال بھی ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو پہچاننے کی کوئی دلیل نہیں۔سوائے اللہ تعالیٰ کا کلام اور رسول

خدا ﷺ کے فرمان کے۔ حدیث شریف میں ہے **تَفَكَّرُوْا فِيْ صِفَاتِهٖ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِيْ ذَاتِهٖ** یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سوچ و بچار کرو اور اس کی ذات میں نہ سوچو۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کی پہچان صرف اس کی صفات اور اسماء سے ممکن ہے۔ ساری کائنات اس کی صفات کی مظہر ہے مثلاً خالق میں صفت خلق کی ہے یا اسم رزّاق میں صفت رزّاقیت کی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے اللہ کی معرفت اس کی صفات کی معرفت ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے اس کے اسماء اور صفات بھی قدیم ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جملہ صفات سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور پر ان کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔

اصل مدعا اپنے نفس کی معرفت حاصل کرنا ہے، اپنی جہالت کو رفع کرنا ہے اور اپنے خیال اور عمل کو صحیح اصول کا کاربند کرنا ہے۔ جیسا کہ روایت ہے۔ **مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ** یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ یعنی جو خود شناس ہوتا ہے وہی حقیقت میں خدا شناس ہوسکتا ہے۔ معلوم ہوا جو شخص اپنی فطرت کے نقائص و عیوب کو پہچان لیتا ہے اور ان کا مداوا کر لیتا ہے وہی حقیقت کو پالیتا ہے۔

فرمایا: ضعیف اور محتاج ہونا انسان کی صفت ذاتی ہے جو اس سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿فاطر: 15﴾

''لوگو تم (سب) اللہ تعالیٰ کے محتاج ہو اللہ تعالیٰ تو بے نیاز اور سزاوار حمد و ثنا ہے''

بلاشبہ انسان قوتوں اور قابلیتوں کا ایک بڑا خزانہ اپنے اندر رکھتا ہے لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی ناتوانی اور احتیاج کو جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ خود کچھ نہیں ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جن قوتوں اور قابلیتوں کے ذریعہ وہ یہ سارے تصرفات کر رہا ہے ان میں سے کسی قابلیت کو بھی وہ خود وجود میں نہیں لایا اور نہ ہی ان چیزوں کو جن پر وہ تصرفات کر رہا ہے اس کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ یہ ساری چیزیں کسی اور زبردست طاقت کی بخشی ہوئی امانت ہیں اور اسی ہستی کے بنائے ہوئے طبعی قانون کی پابند ہیں جب یہ احساس پختہ ہو جاتا ہے تو انسان میں فطری طور پر ایک اَن دیکھی زبردست ہستی کی احتیاج ابھرتی ہے۔ لہذا جب انسان کو اپنے نفس کی معرفت یعنی اس کی محتاجی اور ضعف کا یقین حاصل ہوتا ہے تو اس کی اپنی ذات کی نفی ضروری ہو جاتی ہے۔ پھر وہ نسبت رسول ﷺ کے حصول میں کوشاں ہوتا ہے اور اسی نسبت کی پختگی سے اسے معرفتِ الٰہی حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنی زندگی میں کامیاب اور کامران ہوتا ہے۔

کتنی مدت میں ولی اللہ بن سکتا ہے؟

فرمایا: جو آدمی شریعت پر پورے طور پر کاربند ہو کر راہ سلوک میں قدم رکھتا ہے وہ مرشد کامل کی توجہ سے بہت جلد ولی اللہ بن سکتا ہے۔ اس کا سبب صرف ارادہ اور جذبہ کا بدلنا ہے۔ ایک نقشہ بنا کر سمجھایا کہ ایک شخص کی دو

کنال ملکیتی زمین ہے اور وہ ایک کنال زمین مسجد کے لئے وقف کر دیتا ہے اور دوسری ایک کنال زمین ذاتی مصرف کے لئے رکھ لیتا ہے اب وقف شدہ زمین پر اسے تا قیامت کوئی تصرف نہیں رہتا اور یہ سارا اثر محض اس کے خیال کی پختگی اور ارادے کی تبدیلی سے ہوا۔ یہ شعوری اقدام ہے۔ اب زندگی بھر اسی فیصلے اور جذبے کی نگہداشت ہے یہی حال سالک کا ہے جونہی اس نے ایک مرشد کامل سے بیعت کی اور اپنے قلب کو اللہ کے لئے وقف کر دیا وہ اپنے مرشد کی توجہ سے درجہ ولایت میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد تمام زندگی اسی وقف کی نگہداشت ہے جو شیخ کامل کی محبت اور توجہ سے اس کے لئے آسان ہو جاتی ہے اور مقاماتِ ولایت کا حصول اسی نسبت کی پختگی اور دوام پر منحصر ہے۔

صوفی یا ولی اللہ کا احتساب

فرمایا: صوفی یا ولی اللہ ہر دم حضوری میں رہتا ہے اور وہ اپنی حالت کا ہر وقت احتساب کرتا رہتا ہے۔ حکم ہے کہ دن میں سو بار استغفار کرو۔ کہا جاتا ہے کہ تسبیح کے دانوں پر ہر دن میں سو بار استغفار پڑھ لینا چاہیے۔ حالانکہ یہ مدعا کے برعکس ہے۔ مدعا تو یہ ہے کہ اپنے مشغول وقت کو سو حصوں میں تقسیم کرے اور ہر ایک ساعت گزرنے کے بعد استغفار پڑھ کر اپنا محاسبہ کرے اور اپنے مالک کے ساتھ معاہدہ پختہ کرے اور حضوری میں اگر فرق آیا ہو تو پھر اسے قائم کرے۔ ایسا قلب انوار الہیہ کا خزینہ ہو جائے گا اور آندھیوں میں بھی لوہے کی لاٹھ بنا رہے گا۔ ایسے قلب کی دعا موجبِ اجابت ہوگی۔

فرمایا: دنیاوی مشاغل میں مشغول رہنے کے باوجود صوفی کو حضوری میں رہنا چاہیے۔ مثلاً فرمایا مشاہدہ ہے کہ پانی بھرنے والی عورتیں پانی کے گھڑے سر پر رکھ کر چلتی جاتی ہیں باتیں بھی کرتی جاتی ہیں اور سر کے اوپر گھڑوں کو ہاتھ سے بھی نہیں پکڑتیں مگر پھر بھی گھڑے گرتے نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی قلبی طاقت اور توجہ گھڑوں میں ہوتی ہے۔ اسی طرح قلبی طور پر صوفی کو ہر دم حضوری میں رہنا چاہیے تا کہ دنیاوی مشاغل اسے اس حضوری سے غافل نہ کر سکیں۔

فرمایا: صوفی کو صاحبِ حال ہونا چاہیے جو پڑھا جائے اس سے حال کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ بہت سے وظائف اور ختم پڑھنا جن میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔

فرمایا: ولی وہ شخص ہوتا ہے جس کی اپنی ذات مفقود ہو چکی ہوتی ہے ایسی صورت میں وہاں کوئی اَور ذات کارساز ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو جنّ چڑھ گیا ہے۔ جنّ نظر نہیں آتا لیکن ایسے شخص کی تمام حرکات اس کے حکم کے تابع ہوتی ہیں۔ یہی حال ولی اللہ کا ہوتا ہے۔

فرمایا: ولی اللہ کی صحبت کا کمال اثر ہوتا ہے وہ جس جگہ رہتا ہے جس زمین پر چلتا ہے اس کی قیمت اور ہو جاتی ہے اس لئے کہ حدیث مبارک ہے کہ اولیاء اللہ کا ہم مجلس کبھی بد بخت نہیں ہوسکتا۔

هُمْ قَوْمٌ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ

''وہ ایسے لوگ ہیں جن کے پاس بیٹھنے والے بدنصیب نہیں ہوتے''

معمولی جذامی (Leper) شخص اکثر صحت مندوں کو جو اس کے ساتھ یا قریب آئیں بیمار کر دیتا ہے تو کیا اللہ کا دوست اپنے ہم مجلس احباب پر اثر انداز ہوئے بغیر رہ سکتا ہے؟ آگ کی گرمی اس کے قریب کھڑے یا بیٹھے ہوئے شخص کو فوراً محسوس ہو جاتی ہے۔ یہی حال اللہ کے ولی کا ہوتا ہے اس سے ملنا اور اس کے ساتھ بیٹھنا یقیناً اثر انداز ہوتا ہے۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

یک زمانہ صحبت با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعتِ بے ریا

فرمایا: ہر وقت اپنا دل مالک کی یاد سے گرمائے رکھنا چاہیے اور کوئی لمحہ ایسا نہیں ہونا چاہیے جو غفلت کا ہو اور اس کی حضوری سے خالی ہو خدمت خلق برائے رضائے خالق یہ اعلیٰ ترین ذریعہ خدمت ہے اور فریضہ ہے۔ صرف یہ خیال رہے کہ اس خدمت میں اپنی ذاتی غرض بالکل نہ ہو پھر ایسی خدمت اپنی روحانی ترقی کا باعث بھی ہو جاتی ہے۔

فرمایا: مخلوقِ خدا سے شفقت اور نرمی سے سلوک کرنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے اور ان سے شفقت اور نرمی کو پسند فرماتا ہے۔ نیز فرمایا کہ دل پر میل نہ آنے پائے جب کبھی ذرا سی غفلت ہو تو فوراً استغفار پڑھ کر پھر اللہ تعالیٰ کا ذکر شروع کر دینا چاہیے۔ جہاں تک ہو سکے دل کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہونے دیں۔ جب تک اللہ تعالیٰ سے انسان دور ہوتا ہے وہ اَور بات ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ کے فضل سے مالک الملک کا قرب نصیب ہو جائے تو پھر زیادہ ہوشیاری اور احتیاط لازمی ہو جاتی ہے۔

فرمایا: دل جو مالک الملک کا آئینہ ہے صرف مالک الملک کی یاد سے منور رکھنا چاہیے اور صاف وشفاف رکھنا چاہیے۔ ذکرِ الٰہی سے ہر دم حضوری حاصل کرنا چاہیے۔

ولی اللہ کی موت

فرمایا: تین قسم کے آدمی ایسے ہوتے ہیں جنہیں اللہ پاک اسم اعظم عطا فرماتا ہے اور وہ دنیا میں عزت اور شہرت پاتے ہیں۔

1۔ بادشاہِ وقت جس کی پیشانی میں اسم اعظم ہوتا ہے۔

2۔ عالمِ اجل جس کی زبان پر اسم اعظم ہوتا ہے۔

3۔ ولی اللہ جس کے رگ و ریشہ میں اسم اعظم سرایت کر چکا ہوتا ہے۔

بادشاہِ وقت اور عالم کی موت کا جب وقت قریب آتا ہے تو ملک الموت کو ان کی روح قبض کرنے کا حکم ہوتا ہے تو فرشتہ عرض کرتا ہے کہ باری تعالیٰ ان کے پاس تو اسم اعظم ہے۔ حکم ہوتا ہے کہ پہلے اسم اعظم اٹھا لو۔ حکم ربی سے ان سے اسم اعظم اٹھا لیا جاتا ہے اور وہ مردہ ہو جاتے ہیں۔ تاریخِ عالم سے ثابت ہے کہ بڑے بڑے جابر بادشاہ اور عالمِ بے بدل پیدا ہوئے اور ختم ہو گئے مگر ان کا نام و نشان مٹ گیا ان کا رعب و دبدبہ وقتی تھا۔ جو مفقود ہو گیا۔

لیکن جب ولی اللہ کی رحلت کا وقت قریب آتا ہے تو ملک الموت عرض کرتا ہے کہ یا رب العٰلمین اس کے تو رگ و ریشے میں اسم اعظم سرایت کر چکا ہے کس مقام سے اٹھاؤں؟ حکم ہوتا ہے کہ اس کو اصلی اسم اعظم کی تصویر دکھاؤ۔ جب ایسا ہوتا ہے تو ولی اللہ کی روح بے قرار ہو جاتی ہے یا تو فوراً جسم کو چھوڑ دیتی ہے یا فرشتے کو بتایا جاتا ہے کہ فلاں وقت آ جائے۔ چنانچہ کئی اولوالعزم اولیاء اللہ اپنی وفات سے قبل بتا دیتے ہیں کہ فلاں دن اور فلاں وقت رخصت ہوں گے اور وہ اسی وقت رخصت ہوئے۔ لیکن وہ اسم اعظم جو اس ولی اللہ کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے اس کا اثر کلی طور پر زائل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ مٹی کے برتن میں بھرا ہوا گھی اگر نکال بھی لیا جائے تو اس کے اثرات برتن میں قائم رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس مقام (قبر) میں ان کا جسمِ خاکی رکھا جاتا ہے وہاں انوار کا نزول ہوتا رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ لوگ ایسے اصحاب کی قبروں پر جاتے ہیں اور ان کے فیوض سے فیض یاب ہوتے ہیں اور یہ اللہ کے اُس اسمِ اعظم کی عظمت سے ہے جو ان کے اجسام میں سرائیت کر چکا ہے۔

هرگز نه میرد آنکه دلش زنده شد بعشق
ثبت است بر جریدهٔ عالم دوامِ ما

مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا

فرمایا: حدیث پاک ہے **مُوتُوا قَبلَ اَن تَمُوتُوا** ''مرنے سے پہلے مر جاؤ''۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ رضائے الٰہی کے لئے اپنے جذبات کو اسی زندگی میں اس کے حوالے کر دو۔ اسی کیفیت سے مومن کو فراست عطا ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے۔

اِتَّقُوا فَرَاسَةَ الْمُوْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ

''مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے''

فرمایا: دنیا میں رہتے ہوئے اخروی زندگی کی یاد کو تازہ رکھنا چاہیے۔ مدعا یہ ہے کہ مرنے سے پہلے اُس مقام پر متمکن ہو جاؤ جہاں موت کے بعد جانا ہے۔ یہ مقام مجاہدۂ نفس سے حاصل ہوتا ہے اور شیخ کامل کی تعلیم سے میسر آتا ہے اور یہ نسبت رسولﷺ کے حصول کا نتیجہ ہے۔

فرمایا: یہ زندگی عارضی ہے اصلی زندگی آخرت کی زندگی ہے جو دائمی اور شدنی ہے۔ جہاں موت کے بعد جانا ہے اس کا استحضار ہر دم رہے اور اپنا محاسبہ کرتا رہے تا کہ اس کی رفتارِ زندگی مالک کی رضا کے حصول میں گزرے اور یہاں کی لذات میں الجھ کر اپنے اصلی مقام کو بھول جانا ہی نامرادی اور خسران ہے۔

فرمایا: مالک کی رضا کے لئے کام صرف اسی دنیاوی زندگی میں ہو سکتے ہیں یہ موقع کسی اور جگہ نہیں مل سکتا اس لئے اس موقع کو غنیمت سمجھے اور اپنی زندگی واصل بحق اور مخلوق کی خدمت میں گزارے۔ اس زندگی کا ایک لمحہ اخروی زندگی کے ہزارہا برس سے زیادہ قیمتی ہے کیونکہ ممکن ہے کہ وہی ایک لمحہ اس کی بقیہ زندگی کو راہِ راست پر لانے کا باعث ہو جائے۔

مرزائیوں کا شوقِ تبلیغ

فرمایا: مرزائی مبلغ بڑے اچھے طریقے سے کام کرتے ہیں اپنے رہنما کی غلط سلط باتوں کو پوری محنت سے آگے بڑھاتے ہیں۔ یہ نہ صرف ہندوستان اور پاکستان میں تبلیغ کرتے ہیں بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں بھی باقاعدہ تنظیم کے ماتحت کام کرتے ہیں ان کی مرکزی تنظیم جو پہلے قادیان (مشرقی پنجاب) میں تھی آج کل ربوہ (ضلع سرگودھا۔ پنجاب) میں قائم ہے وہ بڑی سرگرمی سے اپنی تبلیغ میں مشغول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرزائیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے بالخصوص غیر ممالک میں ان کے کئی سینٹر قائم ہو چکے ہیں۔

فرمایا: ایک دفعہ میرے پاس بارہ مرزائی صاحبان حاضر ہوئے۔ انہوں نے اپنا تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ وہ سبھی گورنمنٹ کے مختلف محکموں میں اعلیٰ افسر ہیں اور وہ چھ چھ ماہ کی چھٹی لے کر اپنے خرچ پر تبلیغ کے پروگرام پر نکلے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے دعا کیلئے درخواست کی۔ چونکہ انہوں نے علاقہ غیر میں تبلیغ کرنے کا ارادہ کیا تھا اس لئے انہوں نے ہمارے شجرہ شریف کی ایک ایک کاپی مانگی جو میں نے انہیں دے دی۔

موہڑہ شریف آئے ہوئے چند مولوی صاحبان سمجھنے لگے کہ مرزائی صاحبان تائب ہو گئے ہیں اسی لئے انہوں نے شجرہ شریف کی کتابیں حاصل کی ہیں۔ ان کا یہ خیال صحیح نہ تھا بلکہ مرزائی لوگ بڑی سمجھ والے تھے انہوں نے یہ اس لئے حاصل کی تھیں تا کہ اُس علاقہ میں کوئی مشکل پڑنے کی صورت میں وہ اپنے آپ کو موہڑہ شریف سے وابستگی کا

ثبوت پیش کرسکیں اوراس طرح اپنی جان بچاسکیں۔

فرمایا: مرزائیوں کا شوقِ تبلیغ دیکھیں کہ وہ اپنے غلط مسلک کیلئے کتنی تگ ودو کرتے ہیں اورادھر ہمارے کئی مولوی صاحبان نے لوگوں کو باہمی تفرقوں میں الجھادیا ہےاورنت نئے جھگڑے کھڑے کردیتے ہیں۔

فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ اگر قادیانی فتنہ پیدا نہ ہوتا تو ہمارے اکثر مولوی صاحبان تو غفلت میں ہی پڑے رہتے۔ چونکہ وہ جماعت اپنی تبلیغ سے بڑے زوروشور سے سادہ لوح مسلمانوں کوگمراہ کررہی ہےاس لئے ہمارے بعض مولوی صاحبان بھی ان کے مقابلے کے لئے دین کی خاطر کچھ محنت کرتے ہیں۔مگرافسوس کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ باہمی فرقہ بندیوں کے جھگڑوں میں الجھ گئے ہیں جس سے بجائےمسلمانوں میں محبت اورآشتی پیدا کریں انہیں مغائرت کا درس دیتے ہیں اوردین سے دوری کا باعث بن جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ انہیں صحیح سمجھ دے۔

مرزائیوں سے مناظرہ

فرمایا: ایک دفعہ مولوی محمداشرف جوقادیانیوں کے مبلغین کاسیکریٹری جنرل اوراپنے کام میں بڑاچالاک اور بیدارمغز تھااپنے چندحواری مولویوں کے ہمراہ میرے پاس آیااورکہا کہ ہم امیر جماعت قادیان (مرزابشیرالدین محمود) کی طرف سے مامور ہیں کہ آپ سے بحث کریں اورآپ کےفتوےکواپنا مشعل راہ بنائیں کہ قادیانیوں کا طریقہ حقیقت میں صحیح ہے یاغلط ہے۔ان کی یہ بات تحقیق وتلاش کی غرض سے نہ تھی بلکہ مجادلانہ ومکابرانہ رنگ میں پیش کررہے تھے اورحق کی تلاش مقصود نہ تھی۔ چنانچہ ان سے تین دن بعد بحث ومباحثہ کا وقت ٹھہرا اور وہ چلے گئے۔ان تین دن کی مہلت میں میں نے کوشش کی کہ کوئی ایسااعلیٰ درجے کا مباحث مولوی مل جائے جوان سے بحث کرسکے۔اس مقصد کیلئے ایک اشتہار بھی دیا گیا کہ جومولوی صاحبان مناظرہ کیلئے تشریف لائیں گے۔آمدورفت،خوراک ورہائش کے علاوہ معقول یومیہ الاؤنس بھی دیاجائے گا۔

محمداشرف کا سُن کرکوئی مولوی تشریف آوری کی جرأت کم ہی کرتا تھا۔اللہ اللہ کر کے سات آٹھ مولوی صاحبان اکٹھے ہوگئے۔تیسرے دن حسبِ وعدہ مولوی اشرف اپنی ایک بڑی پارٹی لیکرآ گیا۔میں نے کہا کہ کچھ بحث آج ہوگی اورکچھ کل اسی طرح تدریجاً بحث کا سلسلہ جاری کریں گے۔اُس نے منظورکرلیااورمناظرمولوی صاحبان آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ مجھے انہوں نے **حکَم** مقررکرلیا۔سوالات کا سلسلہ قادیانی مولوی صاحبان نے شروع کیا۔ میں نے اپنے مولوی صاحبان سے کہا کہ سوالات کے جوابات دیئے جائیں۔ جوسوالات بھی ان کی طرف سے کئے گئے وہ منقول تھےان کے جوابات جومیرے مولوی صاحب نے دیئے وہ معقول تھےمگرصحیح نہ تھے۔اس لئے میں نے فیصلہ دیا کہ

سوالات تو ٹھیک ہیں مگر جوابات درست نہیں۔ اس بات پر مولوی صاحبان مجھ سے ناراض ہوئے۔ اُدھر محمد اشرف اور اس کے ساتھی میری تائید کی وجہ سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ دو دن یہ سلسلہ بحث جاری رہا اور انہوں نے اصرار کیا کہ اب ہم مناظرہ پیر صاحب سے براہِ راست کریں گے۔

تیسرے دن جب اشرف صاحب معہ کثیر پارٹی کے تشریف لائے تو میں نے انہیں کہا:

1۔ چونکہ آپ کے مولوی صاحبان تنخواہ دار ہیں اور وہ مزدوری لیکر یہاں اس بحث کرنے کے لئے آئے ہیں اس لئے وہ بھانت بھانت کی بولیاں بول کر شور و غوغا کرتے ہیں۔ اس لئے میری پہلی شرط یہ ہے کہ میں صرف مولوی اشرف سے بات چیت کروں گا البتہ اگر انہیں کسی سوال کا جواب سمجھ نہ آئے تو اپنے ساتھیوں سے پوچھ کر جواب دے سکتے ہیں۔ چونکہ انکا حوصلہ پہلے دو دنوں میں بڑھ گیا تھا اس لئے انہوں نے یہ شرط مان لی۔

2۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس بحث کے دوران ہمارے درمیان ایک ثالث ہونا چاہیے جو ہمارے جوابات کی جانچ کرتا رہے اور اس کا فیصلہ جانبین کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ میں نے ثالث کا انتخاب ان کے مولوی محمد اسماعیل کو کیا۔ جس سے وہ بہت خوش ہوئے۔

3۔ میری تیسری شرط یہ ہے کہ اس مباحثے میں ایک مجسٹریٹ کا ہونا ضروری ہے جو دونوں کے سوالات لکھ کر اس پر طرفین کے دستخط لیتا رہے اور اسی طرح جوابات پر بھی ایسا ہی کرے تا کہ یہ ایک ریکارڈ کی مکمل صورت بنے۔ یہ شرط بھی منظور کر لی گئی۔

4۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ بطور حفظ ما تقدم پولیس کا ایک افسر اعلیٰ مع پولیس پارٹی کے حاضر رہے تا کہ امن برقرار رہے۔ یہ شرط بھی انہوں نے تسلیم کر لی۔

چنانچہ یہ شرائط طے کر کے ان پر طرفین کے دستخط لے لئے گئے۔

مجسٹریٹ صاحب اور پولیس افسر مع پولیس پارٹی کے ہر دو فریقین کے تقاضے اور درخواست پر موقع پر آ گئے اور مباحثہ شروع ہوا۔

قادیانیوں کی طرف سے مولوی اشرف نے چند سوالات مثل مماتِ عیسیٰؑ وغیرہ پیش کئے۔ میں سب کو تسلیم کرتا گیا اس پر مولوی اشرف نے خوشی کے انداز میں کہا۔ بتاؤ پھر اب کیا رائے ہے؟ میں نے جواب دیا ابھی تک آپ کی طرف سے سوالات تھے اور میں جواب دیتا رہا۔ اب میری باری سوالات کی ہے۔ یہ بھی سنیں اور جواب دیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق جو کچھ آپ کہتے ہیں ہمیں اس سے بحث نہیں۔ عیسیٰؑ خواہ چالیس دفعہ وفات پائیں ہمیں اس سے

کیا غرض۔ ہم تو ان کے دین پر بھی نہیں ہیں۔ ہمارے اپنے پیغمبر ﷺ بھی تو آخر کار رحلت فرما گئے۔ آپ میرے سوالات سنئے اور جواب دیجئے۔ چنانچہ میں نے سوالات شروع کئے:

1۔ اگر آپ یہ ثابت کر سکیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے بوقتِ وفات یا اس سے قبل کوئی ایسی وصیت فرمائی ہو کہ میرے بعد میرے ولی عہد اور وارث مرزا غلام احمد قادیان ہوں گے تو پیش کریں۔ اگر آپ سچے ہیں تو کسی تفسیر سے یا کسی اور کتاب سے یا مرزا صاحب کی اپنی تحریر کردہ کتاب سے۔ چنانچہ مولوی اشرف صاحب اس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ مجسٹریٹ صاحب نے اس پر ہم دونوں کے دستخط لے لئے۔

2۔ کیا آپ کسی مستند کتاب کا حوالہ بتا سکتے ہیں جو متقدمین میں سے کسی نے لکھی ہو کہ مرزا صاحب نبی ہوں گے مثلاً تفسیر وغیرہ۔ جب عاجز آیا تو میں نے کسی غیر مستند کتاب کا حوالہ مانگا۔ مثل رسالہ، اخبار یا کسی ہندو، یہودی یا عیسائی کی کسی کتاب سے ہی بتاؤ میں ماننے کو تیار ہوں۔ چنانچہ جواب نفی میں دیا گیا تو یہ سوال و جواب بھی درج کر لئے گئے اور میرے اور مولوی اشرف کے دستخط کرا لئے گئے۔

3۔ میں نے مولوی اشرف سے پوچھا کیا آپ مرزا غلام احمد صاحب کو نبی مانتے ہیں؟ جواباً اس نے کہا بے شک۔ میں نے کہا کہ تم ان کے کردار اور جملہ حالات سے بھی واقف ہو گے۔ جواب ملا بے شک۔ سوال پوچھا کہ تم کو نبیوں، رسولوں اور ولیوں کے متعلق بھی پوری واقفیت ہو گی۔ جواب دیا ٹھیک ہے۔ آپ چونکہ مبلغین کے ہیڈ سیکریٹری ہیں اس لئے سب سے زیادہ مرزا صاحب کی نبوت کے متعلق واقفیت کے مالک بھی ہوں گے۔ جواب دیا گیا ہاں۔ مجھے کافی واقفیت ہے۔ میں نے کہا بتاؤ کہ نبوت کا موضوع کیا ہے؟ اور نبوت کیا چیز ہے؟ جواباً کہا کہ یہ پتہ نہیں۔ نہ ہی اُسے اپنے ہمراہیوں سے امداد مل سکی۔ لہذا یہ سوال و جواب بھی نوٹ کر لئے گئے اور ہر دو کے دستخط لے لئے گئے۔

4۔ میں نے پوچھا: ولایت کا موضوع کیا ہے؟ اور ولایت کیا چیز ہے؟ ولایت کی ابتداء کیا ہے؟ اور ولایت کی انتہا کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے بھی اشرف مع اپنے معاونین کے قاصر رہا۔ چنانچہ یہ سوال و جواب بھی نوٹ کر لئے گئے اور ہمارے دستخط لے لئے گئے۔

5۔ میں نے پوچھا: بتاؤ ولایت اولیٰ ہے یا نبوت؟ اور کیا نبی بھی ولایت کے منازل طے کرتا ہے کہ نہیں؟ جواب ندارد۔ دستخط لئے گئے۔

6۔ میں نے پوچھا: مرزا غلام احمد کی نبوت کا موضوع کیا ہے؟ جواب ندارد۔ دستخط لئے گئے۔

7۔ میں نے پوچھا: کیا غیر نبی کسی کو نبی قرار دے سکتا ہے؟ جواب ندارد۔ دستخط لئے گئے۔

ان ساتوں سوالوں کے جواب میں فرداً فرداً وہ یہی کہتے رہے کہ ہم اس کا جواب بعد میں دیں گے۔ چنانچہ مناظرہ ختم ہوگیا اور تمام مرزائی مولوی خاموش چلے گئے اور آج تک وہ کسی سوال کا جواب نہیں دے سکے اور اس موضوع پر انہوں نے کبھی بات بھی نہیں کی بلکہ نہ تو مولوی اشرف سے پھر کبھی ملاقات ہوئی اور نہ ہی کوئی اَور قادیانی مبلغ ملنے کے لئے آیا۔

اپنے قارئین کی دلچسپی کے لئے راقم الحروف اختصار سے جوابات عرض کرتا ہے۔

1۔ موضوع نبوت کیا ہے؟ رسول اور نبی اللہ تعالیٰ اور مخلوق کا رابطہ اور وسیلہ ہوتا ہے۔

2۔ موضوع ولایت کیا ہے؟ معرفت الٰہی اور ولایت کبریٰ کا حصول۔ ولی اللہ (سالک) مخلوق اور نبی اور اللہ کے درمیان رابطہ ہے۔

3۔ مرزا صاحب کی نبوت کا موضوع کیا ہے؟ مرزا صاحب کی نبوت آیت قرآنی

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴿البقرۃ: 4﴾

''جو اس کتاب پر جو (اے محمدؐ) تم پر نازل ہوئی اور جو کتابیں تم سے پہلے انبیاء پر نازل ہوئیں سب پر ایمان لاتے ہیں''

کے مطابق مرزا صاحب ان دونوں درجوں سے خارج ہیں لہذا وہ صاحبِ ایمان بھی نہیں، وہ نبی کیسے ہو سکتے ہیں۔

4۔ کیا ولایت کے حصول کے بغیر نبی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ نبوت سے پہلے ولایت کبری کا مقام ہر نبی کو حاصل ہو جاتا ہے جو نیابتِ رسول کا مقام ہے۔ اس کے بغیر کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔

5۔ ولایت کا معیار کیا ہے؟ فنا فی اللہ ہو کر بقا باللہ ہونا جو متابعتِ رسول ﷺ کے بغیر ممکن نہیں۔

6۔ کیا نبی کی ولایت افضل ہے یا نبوت؟ جس کا عقیدہ ہو کہ ولی نبی سے افضل ہے وہ زندیق ہے۔

7۔ کیا غیر نبی کسی کو نبی قرار دے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ نبوت وہبی چیز ہے اکتسابی نہیں۔ اس کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے۔ جیسا کہ حضرت جبرائیلؑ نے غارِ حرا میں پہلی وحی کے موقع پر حضور اکرم ﷺ کو خطاب فرمایا **"یا محمد انت رسول اللہ وانا جبریل"** ''اے محمد ﷺ آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبریل ہوں''

حضور ﷺ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آ سکتا اور جو شخص اپنے نبی ہونے کا دعوی کرتا ہے اور جو اس دعوے کو تسلیم کرتا ہے وہ دائرہ اسلام سے خارج اور مرتد ہے۔

داڑھی کا مسئلہ اور مریدوں کا حال

مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) سے کومیلا بار ایسوسی ایشن کے صدر جناب فصیح الدین احمد صاحب موہڑہ شریف کی حاضری کے لئے راقم الحروف کے پاس 1955ء میں لاہور تشریف لائے۔ انہوں نے اپنے شوق کا اظہار کیا اور اپنے پرانے دوست جناب شجاعت علی صدیقی صاحب سے جو ان دنوں ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل راولپنڈی تھے ان سے بھی ملاقات کا ذکر کیا۔ چونکہ راقم الحروف ان ایام میں لاہور میں کنٹرولر آف ملٹری اکاؤنٹس متعین تھا اور صدیقی صاحب میرے افسرِ اعلیٰ تھے۔ میں نے ان سے جناب فصیح الدین صاحب کے متعلق ٹیلیفون پر بات کی تو وہ خوش ہوئے۔ جب میں نے انہیں بھی موہڑہ شریف جانے کی دعوت دی تو انہوں نے کہا کہ آپ دوپہر کو جب راولپنڈی پہنچیں تو دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیں تو وہ پھر پروگرام بنا سکیں گے۔ چنانچہ وہ بھی ہمارے ساتھ موہڑہ شریف کے لئے تیار ہو گئے۔ ہم تینوں موہڑہ شریف بعد از نماز مغرب پہنچ گئے۔

اگلی صبح بعد از نماز اشراق اعلیٰ حضرتؒ دربار شریف میں تشریف لائے اور ہمیں حاضری کے لئے بلا بھیجا۔ ابتدائی گفتگو کے بعد جناب فصیح الدین سے دریافت فرمایا کہ آپ اس عمر میں (جو 60 سال سے تجاوز کر چکی تھی اور کمزور صورت تھے) کیسے تشریف لائے؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ وہ بچپن سے دین سے دلچسپی رکھتے ہیں مگر اطمینانِ قلبی حاصل نہیں اور بتایا کہ ان کی ملاقات پیر احسن الدین صاحب جو مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ میں کمشنر تھے سے ہوئی ان سے تبادلہ خیال ہوا تو انہوں نے حضور والا کی خدمت میں حاضر ہونے کا مشورہ دیا تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

اعلیٰ حضرتؒ نے صدیقی صاحب سے ان کے تشریف لانے کا مقصد دریافت فرمایا تو انہوں نے بتایا کہ وہ گزشتہ 25 سال سے تبلیغی جماعت سے وابستہ ہیں اور ان کا مشاہدہ ہے کہ لوگ جب مسجد میں بیٹھے ہوں اور انہیں تبلیغی وعظ کیا جائے تو وہ متاثر نظر آتے ہیں مگر جونہی وہ فارغ ہو کر مسجد سے باہر نکلتے ہیں تو وہ اپنے اپنے نجی مشاغل کا ذکر کرنے لگتے ہیں۔ بخلاف ان کے جو حضرات بزرگان کرام کی مجالس میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اثر دیرپا ہوتا ہے۔ لہٰذا میں دو تجویزیں لیکر حاضر ہوا ہوں۔ (1) آپ کے چند وہ مرید جن کو بہت اچھا سمجھا جاتا ہے وہ داڑھی نہیں رکھتے۔ ان کا اثر معاشرے پر بُرا پڑ رہا ہے۔ آپ ان کو حکم دیں کہ وہ ضرور داڑھی رکھیں ورنہ انہیں حلقۂ ارادت سے خارج کر دیا جائے۔ (2) آپ اپنے تمام مریدوں کو حکم دیں کہ وہ خود بھی نمازی بنیں اور کم از کم ایک بے نمازی کو ہر سال نمازی بنائیں۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکیں تو انہیں حلقۂ ارادت سے خارج کر دیا جائے تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔ میں چونکہ

حسابی شخص ہوں میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اگر تمام بزرگانِ کرام اپنے اپنے مریدوں سے یہ کام لیں تو عرصہ پانچ سال میں سارے پاکستان میں تمام لوگ نمازی بن جائیں گے۔ لہذا میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ اس نیک کام کی ابتداء آپ کریں تاکہ آپ کے تتبع میں باقی بزرگانِ کرام اس تحریک میں شامل ہو جائیں۔

اعلیٰ حضرتؒ نے فرمایا کہ صدیقی صاحب! آپ نے ملکہ وکٹوریا کا روپیہ دیکھا ہوگا۔ اگر اس روپے کے ہندسے اور کنگرے گھسے ہوتے تو بازار میں اس کی قیمت 16 آنے تو نہ ملتی مگر بارہ تیرہ آنے ضرور مل جاتی کیونکہ اس کی دھات اصلی (چاندی) ہوتی تھی۔ اگر سکے کا روپیہ ہو جسکے کنگرے اور ہندسے خوب چمکدار اور ابھرے ہوئے ہوں تو ایسے روپے کی کیا قیمت ملے گی؟ صدیقی صاحب نے کہا کہ وہ تو جعلی سکہ ہے۔ اس کا کیا ملے گا۔ اس پر اعلیٰ حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ درست ہے کہ اس کی کوئی قیمت نہیں ملے گی کیونکہ اسکی دھات اصلی نہیں بلکہ امکان غالب ہے کہ جعلی سکہ چلانے کے جرم میں اس شخص کو گرفتار کر لیا جائے۔ اب ہماری صورتِ حال یہ ہے کہ جو شخص بھی ہماری خدمت میں حاضر ہوتا ہے ہم اس کی دھات اصلی کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ رہی داڑھی کی بات، جب داڑھی والا چاہتا ہے تو داڑھی بھی آ جاتی ہے۔

دوسری تجویز کے متعلق فرمایا: اگر اس دربار شریف میں ایک ہزار موم بتیاں اپنی اپنی لَو سے جل رہی ہوں تو ہوا کا ایک خفیف جھونکا آ جائے تو امکان ہے کہ کئی موم بتیاں ان میں سے بجھ جائیں لیکن اگر اسی دربار شریف میں ایک کونے میں ایک گیس لیمپ جل رہا ہو تو ہوا کے خفیف جھونکے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوگا اور اگر ہوا کے تیز جھونکے بھی آئیں تو وہ گیس لیمپ بجھ جانے کی بجائے اور تیز روشنی سے روشن تر ہوگا۔

بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ ہم چھوٹی چھوٹی موم بتیاں تیار کرتے رہیں اس لئے ان موم بتیوں کو بجھانے کی بجائے انہیں جلنے دیں وہ کچھ نہ کچھ روشنی تو دیتی رہیں گی۔ ہم یہاں گیس لیمپ تیار کرتے ہیں جس شخص کی استعداد اس قابل ہوتی ہے ہم اسے روشنی کا گیس لیمپ بنا دیتے ہیں۔ وہ ایسے گیس لیمپ ہوتے ہیں کہ وہ بجھنے کی بجائے مخالفانہ جھونکوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مزید تیز روشنی دیتے ہیں۔

اس گفتگو کے بعد اعلیٰ حضرتؒ نے فصیح الدین صاحب کو بیعت فرمایا اور قلبی ذکر کی تعلیم فرمائی اور چند اشغال بھی بتائے اور فرمایا کہ اگر آپ ان پر مداومت کریں گے تو بفضلہٖ تعالیٰ کامیاب و کامران ہوں گے۔

ان کے طفیل صدیقی صاحب کو بھی ذکرِ قلبی اور چند اشغال تعلیم فرمائے اگرچہ وہ بیعت نہیں ہوئے۔ ہمیں بعد از دعا اجازت فرمائی۔ کچھ عرصہ بعد جناب فصیح الدین صاحب نے مجھے تحریر کیا کہ ان کی رفتارِ زندگی میں خوش کن تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔ جناب صدیقی صاحب نے بھی مجھے بتایا کہ وہ تلقین شدہ ذکرِ قلبی کو باقاعدگی سے جاری

رکھے ہوئے ہیں۔ **الحمد لله علی ذالک**

رزق مقسوم ہے

فرمایا: جو شخص صبح سے شام تک رزق کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اسے بھی وہی ملتا ہے جو اس کے مقسوم میں ہے۔ حضرت غوث الاعظمؒ نے بغداد شریف میں ایک بڑے مجمع کے سامنے ایک دن مختصر تقریر فرمائی کہ لوگو! آپ اس چیز کے لئے سرگرداں ہیں جو پہلے سے تقسیم ہو چکی ہے اور یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ آپ اپنی قیمتی زندگیوں میں ایک تقسیم شدہ چیز کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اصلی بات کو پہچانو اور اس کا فکر کرو جو تمہارے آگے آنے والی ہے یعنی آخرت کی زندگی۔ لہٰذا رزقِ حلال کو حلال ذرائع سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہو۔ جو تمہارا مقسوم ہے وہ تمہیں ضرور ملے گا۔

ایک ریٹائرڈ صوبیدار صاحب کا واقعہ بیان فرمایا کہ وہ ہمارے پاس آیا کرتا تھا۔ ایک روز وہ بڑا خوش خوش نظر آتا تھا میں نے اس سے معاملہ دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ میں نے کافی عرصہ سے کمانڈر انچیف صاحب کو درخواست دے رکھی تھی کہ مجھے فوجی خدمات کے صلہ میں زمین ملنی چاہیے مگر باوجود تمام کوششوں کے مجھے زمین نہیں ملتی تھی اور نہ ہی جنرل صاحب سے ملاقات کی اجازت ملتی تھی۔ اب میں نے جنرل صاحب سے ملاقات کا طریقہ یہی سوچا کہ ان کی جب کار آئے تو میں سامنے کھڑا ہو کر فوجی سلام پیش کروں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ جنرل صاحب نے کار روکی اور وجہ پوچھی۔ میں نے اپنی درخواست پیش کر دی تو جنرل صاحب نے فرمایا کہ جو زمین سول حکومت نے فوجیوں کو دی تھی وہ تو سب تقسیم ہو چکی ہے اَب آئندہ کا انتظار کرو۔ صوبیدار صاحب اس جواب سے مطمئن ہو گئے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جب مالک الملک فرماتا ہے کہ تمہارا رزق تقسیم شدہ ہے تو اس پر ہمیں کیوں اطمینان نہیں ہوتا اور ہم غلط ذرائع سے رزق حاصل کرنے میں اکثر سرگرداں رہتے ہیں۔

محبت غیر مرئی قوت ہے

فرمایا: کسی زمانہ میں میں نے بہت سے سانپ پال رکھے تھے۔ وقت آیا کہ میں نے سب کو آزاد کر دیا۔ مگر ان میں سے ایک سخت زہریلا سانپ جس کی بوتل جنگل میں پھینکوا دی گئی تھی کئی روز بعد دیکھا گیا کہ وہ اپنی بوتل کے گرد کنڈلی لگا کر بیٹھا ہے۔ کیونکہ اس کو بوتل کے ساتھ غیر مرئی لگاؤ ہو گیا تھا۔ یہ بوتل کے ساتھ محبت کا نتیجہ تھا۔ محبت غیر مرئی قوت ہے اور اللہ تعالیٰ نے محبت کا جذبہ اپنی تمام مخلوق کو عطا کر رکھا ہے۔

انسان کو اپنے مالک کا عبد بننے کا حکم ہے **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴿الذریت:56﴾**

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ عبادت کیا ہے اور کیسے حاصل ہوتی ہے۔ عبادت بغیر محبت عبث اور بے کار ہے۔ محبت الٰہی کا جذبہ

چونکہ فطرتاً انسان کے خمیر میں رکھا گیا ہے اس لئے عبادت بھی ایک فطری امر ہے۔ جس طرح محبت کے کئی درجے ہیں یعنی خفیف، شدید اور اشد۔ اسی طرح عبد یا عبادت کے بھی درجے ہیں۔ اس لئے قرآن مجید میں مومن کی یوں تعریف بیان کی گئی ہے **وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ** جو مومن ہیں ان کو اللہ کے ساتھ شدت سے محبت ہے یہی اصل دین ہے اور حاصل ایمان ہے۔ محبت ہے تو سب کچھ ہے محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ محبت کی صورت میں محبوب کا خیال ہر لحظہ دل کو تڑپاتا رہتا ہے۔ اسی طرح اگر اسے اللہ کے قرب حاصل کرنے کی صحیح طلب ہے تو اس کا ہر فعل اسی نقطہ کو نگاہ میں رکھے ہوتا ہے اور وہ اللہ کی عبادت میں مشغول ہوگا حتیٰ کہ بظاہر معیوب کام بھی اس میں شامل ہوں گے۔ اسی ضمن میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا واقعہ بیان فرمایا۔ جس کا قبلہ اللہ کی محبت ہوتا ہے اس کا ہر کام اسی کے حکم کے ماتحت ہوتا ہے۔

دین اور ایمان کی حفاظت

فرمایا: اس زمانۂ فساد میں اپنے دین اور ایمان کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ اپنے آپ کو نسبت رسولﷺ میں قائم رکھیں اور کسی کے خلاف کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ کم عقل لوگوں سے بحث وتمحیص نہیں کرنا چاہیے۔ اپنی اور اپنی جماعت کی پختگی مقصود ہونی چاہیے۔ گمراہ کن عقائد جو کسی روپ میں بھی ہوں ان سے اجتناب ضروری ہے۔ دین کو زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہونا چاہیے۔ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے اور دوسرے مذاہب سے جداگانہ، مزاج اور نوعیت رکھتا ہے۔ لہٰذا اس امتیاز کو قائم رکھنا چاہیے۔ دوسری تہذیبوں سے متاثر ہو کر ان کی باتوں کو دین میں شامل کر لینا اور زندگی کے تمام شعبوں سے دین کو نکال کر پرائیویٹ معاملہ سمجھ لینا دین کے لئے نہایت مہلک ہے۔ اس طرح دین کا سارا ڈھانچا بگڑ جاتا ہے۔

دین اور ایمان کی حفاظت کا تقاضا ہے کہ نسبت رسولﷺ کے تعلق کو مضبوط کرے۔

بہ مصطفٰے برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
گر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ایست

دینی تعلیم وتربیت کی ضرورت

فرمایا: رسول کریمﷺ کی خدمت اقدس میں ہر وقت صحابہ کرام کا مجمع لگا رہتا تھا۔ حضور انورﷺ ہر نماز کے بعد حاضرین کے سوالات کے جوابات دیتے اور احکام الٰہی عطا فرماتے نیز جزوی مسائل پر بھی روشنی ڈالی جاتی۔ فقہ کا علم صحابہ کرام انہی مجالس میں سیکھتے تھے۔ جس مجلس میں حقائق و معارف کی تعلیم ہوتی اس میں خاص خاص صحابہ کرامؓ علوم الٰہیات، دینی اسرار و رموز سیکھتے اور اپنے آپ کو مختلف اطرافِ عالم میں پیغامِ رسالت پہنچانے کیلئے

تیار کرتے تھے۔ انہی مجالس میں تربیت پا کر بعض اصحابِ صفہ تبلیغ دین کے لئے باہر بھیجے جاتے تھے۔ یہ انہی مجالس کا فیض تھا جس نے خلفائے راشدین جیسی ہستیاں پیش کیں اور بے مثال فاتح اور بہادر جرنیل پیدا کئے۔ جنہوں نے اس وقت کی دو سپر پاورز (Super Powers) سلطنت روما اور سلطنت فارس کو زیرنگوں کیا جو سینکڑوں سال سے قائم تھیں۔

فرمایا: جب آفتاب رسالت ﷺ سے فیض یاب ہونے والے بلند مرتبہ صحابہ کرامؓ کے لئے تعلیم وتربیت رسولی ﷺ کی ضرورت سمجھی گئی تو آجکل کے مولوی صاحبان اور صوفیوں کے لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خود بخود کامل بن جائیں یا شیخ کی ایک ہی نظر سے وہ ولی بن جائیں۔ دین کی بنیادی ضروریات کا بھی علم نہیں، قرآن حکیم اور حدیث شریف سے نابلد ہیں اور نہ ہی حصول علم کے لئے تڑپ رکھتے ہیں لیکن عوام کو دھوکا دینے کیلئے اونچے اونچے دعوے کرتے ہیں اور بناوٹی قصے کہانیاں بیان کرتے ہیں۔

فرمایا: غور کا مقام ہے کہ موجودہ زمانے کے پڑھے لکھے مگر غیر تربیت یافتہ لوگ کتنی سنگین غلطی میں مبتلا ہیں کہ چند کتابیں پڑھ لینے سے وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ بڑے عالم اور دانشور بن گئے ہیں اور بدبختی سے دین حقہ کے معاملات میں وہ نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں اور شکوک وشبہات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

فرمایا: رسول اللہ ﷺ پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن مجید میں درج ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے آپ کو علم دیا جاتا تھا جیسا کہ قرآن نے واضح کیا ہے **ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ** (پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمہ ہے) یہ وحی خفی کا ثبوت ہے۔ جو حدیث اور سنت کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ بہت بڑا خزانہ صرف مسلمانوں کے پاس موجود ہے۔

فرمایا: اکثر کہا جاتا ہے کہ حدیث وسنت کی تدوین حضور ﷺ کی وفات کے تقریباً دوسو سال بعد شروع کی گئی اس لئے قابل اعتبار نہیں۔ یہ زبردست شیطانی دھوکا اور فریب ہے۔ صحیح وغلط روایات کی تمیز کا علم ایک ایسا عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی اور قوم کے پاس نہیں ہے۔ سخت بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس علم کو حاصل کئے بغیر مغربی مستشرقین کے بہکاوے میں آ کر حدیث وسنت کو ناقابل اعتبار ٹھہراتے ہیں اور نہیں جانتے کہ ان کی اس جاہلانہ جسارت سے وہ اپنے آپ کو اور اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

لہٰذا موجودہ حالات میں صحیح دینی تعلیم وتربیت کی اشد ضرورت ہے عقائد کی درستی بنیادی کام ہے اور اس پر عمل پیرائی اللہ والوں سے تعلق پیدا کر کے اور ان کی صحبت میں بیٹھ کر حاصل ہو سکتی ہے۔ محض کتابیں پڑھنے سے ممکن نہیں۔ خدا کا حکم ہے:

وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ج ﴿لقمن:15﴾

''اور جو شخص میری طرف رجوع لائے اسی کے رستے پر چلو''

دنیاوی عزت اور ترقی

فرمایا: دنیاوی عزت اور ترقی مالک کے ہاتھ میں ہے۔امان اللہ خان والئی کابل کا واقعہ بیان فرمایا۔ میں اس روز بمبئی میں تھا جس روز ولایت جاتے ہوئے تاج محل ہوٹل کے سامنے وسیع وعریض میدان میں امان اللہ خان کا استقبال ہوا تھا۔اس روز اس میدان میں مخلوق کا اتنا بڑا اجتماع تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر ایک باجرے کا دانہ اوپر سے پھینکا جائے تو وہ زمین پر نہ گرے۔استقبال کی کاروائی کے بعد ایک پیر صاحب امان اللہ خان سے ملے اور اسے کہا کہ ولایت جاتے ہوئے یا واپسی پر ہفتہ عشرہ مکہ شریف اور مدینہ شریف میں بھی ٹھہرنا چاہیے۔لیکن اس نے کہا کہ یہ میرے پروگرام میں نہیں ہے۔اس نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔مگر جب واپس آیا تو طورخم کے راستے افغانستان میں داخل ہوتے وقت اس نے سجدہ کیا اور وہاں کی مٹی کو اپنی پیشانی پر لگایا۔گویا اس کے لئے افغانستان کی مٹی مکہ شریف اور مدینہ شریف کی حاضری سے زیادہ اہم ہے۔**نعوذ بالله من ذالک.**

دوسری بار 1929ء میں جب امان اللہ خان معزول ہوکر بمبئی آیا تو اتفاق سے میں اس وقت بھی بمبئی میں ہی موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ اُسی میدان میں ایک کونے میں ایک چبوترے پر ایک کرسی رکھی تھی۔جس پر امان اللہ خان بیٹھا تھا اور اس کے چاروں طرف فوجی گارڈ کا پہرا تھا۔کوئی شخص بھی استقبال کے لئے نہیں آیا تھا۔وجہ یہ ہوئی کہ وہ ردائے ہیبت جو مالک کی طرف سے اُسے ملی تھی جس کی وجہ سے وہ کابل کا بادشاہ بنا تھا وہ اس سے چھین لی گئی تھی۔ بعدازاں اسی امان اللہ خان کا جو حشر ہوا وہ عبرتناک ہے۔

تاریخ انسانی ایسے عبرتناک واقعات سے بھری پڑی ہے اور روزانہ ہماری آنکھوں کے سامنے کئی عبرتناک واقعات نمودار ہورہے ہیں۔ **فَاعْتَبِرُوْا يَا اُوْلِي الْاَبْصَارِ.**

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿آل عمران:26﴾

''ہمارے حبیبﷺ آپ فرمادیں! یااللہ تو ہی شہنشاہِ عالم ہے جس کو چاہے تو سلطنت عطا کردے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔جس کو چاہے تو عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کردے۔ سب خوبی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔بے شک تو ہی ہر چیز پر قادر ہے''

کسی فرد یا قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ حکومت اور عزت کو اپنا پیدائشی حق سمجھنے لگے اور اس فریب میں مبتلا رہے۔ کہ خواہ اسکے اعمال اور کردار کتنے ہی پست اور داغدار ہوں۔ نہ تو اس سے حکومت چھینی جا سکتی ہے اور نہ ہی اسے عزت سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ سب کچھ مالکِ حقیقی کے دست قدرت میں ہے اور ہر شے اسی کی محتاج ہے۔

انسان کی اصلی زندگی

فرمایا: زندگی دو قسم کی ہے۔ ایک پیٹ اور نفس کی غلامی کی زندگی اور دوسرے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاکﷺ کی غلامی کی زندگی۔ ذات الٰہی کی طرف رجحان کا ہونا نورانیت کا غالب ہونا ہے اور جب روحانی بیداری زیادہ ہوگی تو وہ اپنی نفسانی خواہشات کو زیر کر کے ذاتِ حق کی طرف متوجہ اور راغب ہوگا اور اس کی رضا و خوشنودی کو حاصل کرلے گا۔ یہی انسان کی اصلی زندگی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴿الذریت:56﴾

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں''

فرمایا: انسان کو عقل کی ضرورت ہے مثلاً دنیا میں انسان بھی پانی پیتا ہے اور حیوان بھی۔ لیکن فرق یہ ہے کہ انسان ستھرا پانی پیتا ہے اور حیوان جس قسم کا پانی بھی مل جائے پی لیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان اور باقی جانوروں کے درمیان فرق کرنے والی چیز عقل ہے۔ پھر انسانوں میں بھی باہمی عقل میں فرق ہے۔ انسان میں بشریت اور ملکیت دونوں کا اجتماع ہے۔ جب تک انسان خود اپنے اندر ملکیت نہیں بڑھاتا بشریت مغلوب نہیں ہوسکتی۔ اگر بشریت غالب ہو تو وہ دنیا کی طرف مائل ہوگا۔ اور اس کی زندگی فضول ہوگی اور وہ حقیقی مقصدِ حیات کے حاصل کرنے سے محروم رہ جائے گا۔

فرمایا: ہر ایک شخص مصروف ہے اور انسانی زندگی کا کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں جو مصروف نہ ہو۔ ہر انسان کی زندگی میں وہ تمام خوشیاں اور غمیاں آتی ہیں جو بڑے بڑے بادشاہوں کو پیش آتی ہیں۔ ایک غریب آدمی کے لئے دس روپے کے حصول کے لئے وہی پریشانی ہوتی ہے جو سکندر اعظم کو کوئی ملک فتح کرنے کے لئے پیش آئی۔ **علی هذا القیاس.**

ہر انسان کو اچھائی، برائی کے پیش آنے سے اصلی بات کی یاد دہانی بھی ہوتی رہتی ہے مگر تغافل کے پردے کی وجہ سے وہ جلد بھول جاتا ہے۔ ضمیر اس کو یاد دہانی کراتی ہے۔ ضروری ہے کہ انسان اصلی زندگی اختیار کرے۔ اپنے مالک سے ملی ہوئی زندگی اور مخلوقِ خدا سے تعلق محض اس کی رضا کے لئے رکھنا چاہیے۔ دنیا کی دوسری زندگی محض طفیلی سمجھنی چاہیے۔

فرمایا: ہرانسان سے مالک جوکام لیناچاہتاہےوہ لےلیتاہے۔

؎ہر کسے را بہرے کارے ساختند

کوئی شخص بھی اپنی مرضی سے کسی خاص مقام یا جگہ پر قائم نہیں ہوتا۔ وہ اُس جگہ پر مالک کی مشیئت کے باعث قائم ہوتا ہے۔ جیسے ولایت یا جاپان میں مختلف مشینوں کے پرزے بنائے جاتے ہیں۔ وہ سمندری یا ہوائی جہازوں میں لائے جاتے ہیں اور مختلف جگہوں پر تقسیم ہوتے ہیں۔لیکن ہر مستری یا کاریگر ہر پرزے کے استعمال کو جانتا ہے اور بوقتِ ضرورت متعلقہ مستری اس پرزے کو جس مشین اور جس جگہ کے لئے بنایا گیاہے وہ اسی جگہ اسے استعمال کر لیتا ہے اور وہ پرزہ وہیں کام بھی دیتا ہے۔یہی حال انسانوں کا ہے۔ جو اللہ کے ہاتھ میں پرزوں کی طرح ہیں۔ ہرانسان کو جہاں وہ چاہتا ہے مقرر کر لیتا ہے اور کام لیتا ہے۔اب انسان کی کامیابی کا انحصار اپنی ذمہ داری اور فرائض منصبی کو احسن طریقہ سے پورا کرنے میں ہے۔

فرمایا: بعض لوگ اپنی عدیم الفرصتی، تنگ دستی وغیرہ کی شکایت کرتے ہیں اور مالک کی طرف رجوع ہونے اور دوسروں کو اس طرف بلانے میں عذر کرتے ہیں۔حالانکہ اگر خیال صحیح ہو تو اپنی اور دوسروں کی اصلاح کے بہت سے مواقع روزمرہ زندگی میں اکثر مل جاتے ہیں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تمام درجوں کے لوگوں کے لئے مکمل نمونہ ہیں۔ مزدور، آقا، سپہ سالار، تاجر، فقیر، امیر، بادشاہ غرضیکہ ہر شخص کے لئے وہاں نمونہ موجود ہے۔عدیم الفرصتی اور تمام مشاغل کے باوجود مالک سے پیوستگی میں فرق نہیں آنا چاہیے۔اصحابِ کبار بھی تمام پیشے اختیار کئے ہوئے تھے اور انہوں نے اسلام لانے کے بعد یہ پیشے چھوڑ نہیں دیئے تھے بلکہ وہ اپنی تمام مشغولیتوں کے باوجود دین کی خدمت میں بھی لگ گئے تھے۔ مالک کی طرف بلانا صرف مولویوں کے پیشے کے لئے مختص نہیں ہے۔ بلکہ قرآن تو کہتا ہے **لِكُلِّ قَومٍ هَادٍ** اس لئے کسی پیشے کا آدمی کوئی عذر پیش نہیں کرسکتا اور نہ ہی وہ قابل قبول ہے۔کامیاب انسان وہی ہے جو اسوۂ حسنہ پر قائم رہتا ہے۔

قوتِ اختیار

فرمایا: کلی اختیار محض مالک کو حاصل ہے لیکن اس نے اپنی مشیئت سے انسان کو جزوی اختیار عطا فرمایا ہے اور اسی کو امانت قرار دیا ہے۔جیسا کہ آیت قرآنی سے ثابت ہوتا ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿الاحزاب: 72﴾

''ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین پر پیش کیا تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا بے شک وہ ظالم اور جاہل تھا''

اس امانت کی حفاظت نہایت ضروری ہے لیکن انسان ظلوم وجہول اسلئے ہے کہ وہ بغیر سوچے سمجھے حرکت کر ڈالتا ہے اور نتیجہ سے بے پرواہ ہوتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس اختیار کو رضائے الٰہی کے لئے استعمال کیا جائے۔

بعض تفسیروں میں جو یہ لکھا ہے کہ امانت سے مراد قرآن شریف ہے یا اسی قبیل کی دوسری چیزیں، وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں قرآن کا اتارنا مراد نہیں بلکہ اپنی چیز یعنی مالک کے اختیار کا تفویض کرنا مراد ہوسکتا ہے۔اگر چہ وہ عارضی ہو اور جزوی ہو۔البتہ یہ اختیار خدائی ہدایت یا قرآنی ہدایت کو تسلیم کرنے یا انکار کرنے کے لئے ہے کیونکہ انسان کو اس معاملے میں مجبور نہیں کیا گیا۔اس بات کو یوں سمجھنا چاہیے جیسا کہ ایک بڑے زمیندار کی بہت سی اراضی ہو اور بہت سے مکان بھی ہوں۔وہ اپنے مزارعین کو اجازت دے کہ وہ جو چاہیں ان مکانوں میں کریں اور جیسے چاہیں زمین کو استعمال میں لائیں مگر اس سے ان مزارعین کو کبھی بھی ان کے مالکانہ اختیارات حاصل نہیں ہوسکتے۔انہیں محض عارضی اختیارات حاصل رہیں گے۔

باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًاؕ ﴿الملک 2﴾

''موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے''

موت وحیات کا مقصد ہی یہ ٹھہرایا گیا ہے کہ اس زندگی میں یہ آزمائش ہو کہ کون اعمالِ حسنہ بجالاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی ہدایت کے تمام اسباب مہیا فرما کر انسان کو یہ اختیار بھی تفویض کیا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ بن جائے اور رضائے الٰہی حاصل کرلے یا اپنی من مانی کر کے خسر الدنیا والآخرۃ کا مستوجب ہوجائے۔جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴿الدھر: 3﴾

''اور اسے راستہ بھی دکھایا اب خواہ وہ شکر گزار ہو خواہ وہ ناشکرا''

احکام الٰہی یعنی ہدایت الٰہی بصورت قرآن وسنت رسول اللہﷺ انسان کو اس عطا کردہ عارضی اختیار کے استعمال کرنے کا طریقہ اور اس پر جزا وسزا کی وضاحت ہیں۔جو اختیار اتباع رسولﷺ اور نسبت رسولیﷺ میں استعمال کیا وہی مقبول ہوا اور قابل جزا ہوا۔اس کے علاوہ اختیار کا استعمال مردود ہوا اور قابل سزا ہوا۔

ارکان اسلام کا فلسفہ

فرمایا: اسلامی فلسفہ اور ارکان اسلام کا فلسفہ اپنا امتیاز رکھتا ہے۔ارکان اسلام کا فلسفہ مجموعیت میں ہے اور بمصداق ''خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے'' کی مانند ہے۔غرض و غایت اس میں یہ ہے کہ جیسے ہی خالق کا خیال غالب ہو مخلوق کا خیال مغلوب ہو جائے۔

عبادات، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ مجموعی فلاسفی کی بنا پر ہیں اور ارتباط کی شاہراہ پر قائم کی گئی ہیں۔غرض یہ ہے کہ مجموعی حالت میں ایک بھی صاحبِ دل نسبت رسولﷺ سے آراستہ ہو تو اس کی وساطت سے یہ پرتو وعکس اوروں پر بھی پڑتا ہے اور وہ بھی اس کی وجہ سے منور ہو جاتے ہیں اور ان کا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ اس صاحبِ دل کے طفیل منظور ہو جاتا ہے۔جو اس فلسفہ سے ناواقف ہے وہ اصل میں محروم ہے۔

بیان جاری رکھتے ہوئے فرمایا: جب پانی کے تالاب میں پتھر یا کنکر پھینکا جاتا ہے تو اس سے حلقے پیدا ہو جاتے ہیں۔پہلے چھوٹا حلقہ بنتا ہے جو آہستہ آہستہ بڑھ کر اردگرد وسیع حلقہ بناتا جاتا ہے جیسا کہ شکل سے ظاہر ہے۔

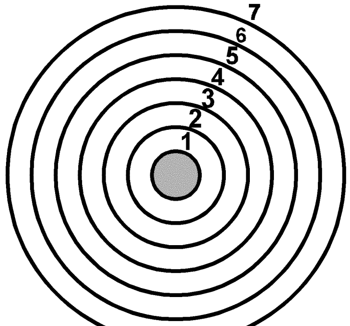

پتھر تو درمیان میں پھینکا گیا لیکن اس سے جو حلقہ پیدا ہوا وہ سب اردگرد کے ماحول کو لپیٹ میں لئے جاتا ہے۔ یہاں تک کہ حلقہ نمبر 7 (آخری حلقہ تک پہنچ جاتا ہے یا اسی طرح کے اور حلقے بنتے جاتے ہیں۔اسی طرح صاحبِ دل اور نسبت رسولﷺ رکھنے والا بزرگ اپنے منور قلب کی لہروں سے سب حاضرین وارد گرد کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور اس کی موجودگی اور توجہ سے تمام حاضرین متاثر ہوتے ہیں اور ان کے قلوب میں بھی تبدیلی آنا شروع ہو جاتی ہے جو بتدریج ترقی کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ صاحبِ دل کی مجلس میں اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور یہ صاحبِ دل بزرگ اکثر حاضرین کے مسائل کے بارے میں بھی گفتگو کرتے ہیں۔جو پُرتاثیر ہوتی ہے۔

عرس شریف کی حقیقت

فرمایا: مجھے کئی علماء (اہل حدیث اور اہل دیو بند) نے لکھا ہے کہ عرس شریف ناجائز، بدعت اور فضول ہے۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ہر فعل کا انحصار اس کے ارادہ، نیت اور خیال پر ہے اگر وہ خیال صحیح ہے تو وہ عمل بھی صحیح ہے جیسے ایک آدمی قتل کرتا ہے تو وہ کافر ہو جاتا ہے مگر ایک قتل ایسا بھی ہے اگر نہ کرے تو کافر ہو جاتا ہے اور اس کے سارے اعمال ساقط ہو جاتے ہیں (یعنی جہاد بالسیف میں قتل) تو معلوم ہوا کہ اگرچہ ظاہری صورت یکساں ہے مگر خیال کے فرق کی وجہ سے عمل میں بھی فرق ہو گیا۔ اسی طرح عرس شریف کا معاملہ ہے۔ اگر عرس شریف اس خیال سے منعقد کیا جائے کہ لوگ جمع کئے جائیں تاکہ آمدنی کی صورت ہو جائے اپنا نام ونمود ہو اور تعلیم دین کا انتظام نہ کیا جائے بلکہ کھیل تماشے کا انتظام ہو اور اس میں شمولیت کرنے والے بھی صحیح تعلیم حاصل کرنے کے لئے نہ آئیں تو ایسا عرس حرام ہے اور اس میں شمولیت ناجائز ہے۔

اسی طرح اگر عرس شریف میں اس خیال سے آیا جائے کہ چلو میلہ دیکھیں گے تماشا ہو گا لطف اندوز ہوں گے تو ایسی حاضری بھی فضول ہے۔ اگر عرس شریف اس لئے منعقد کیا جائے کہ اپنے تعلق والوں کو دین الٰہی کی تعلیم دی جائے اور بزرگان کے یہ ایّام خصوصی انوار کے ایّام ہوتے ہیں اور حاضر ہونے والے بھی اسی تعلیم کے حاصل کرنے کے لئے آئیں تو ایسا عرس فرض بلکہ فرض الفرائض ہے اور اس میں شمولیت موجب صد برکات ہے۔ ایسے ہی مواقع پر ولی اللہ اور شیخ طریقت اپنے ارادت مندوں کو روحانی تربیت اور طریقت کا سبق دیتے ہیں اور جس کو مالک چاہتا ہے خداوند کریم کی بارگاہ تک پہنچا دیتے ہیں اور یہی عرس شریف کی اصل حقیقت ہے۔ اس طرح یہ ریفریشر کورس (Refresher) کی حیثیت رکھتا ہے۔

فرمایا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سالانہ عرس شریف قائم فرمایا یعنی حج کا انتظام کیا اس سنت کو حضور پاک ﷺ نے جاری رکھا اور بزرگانِ عظام نے بھی اسی سنت کو قائم رکھا۔ اب جیسے چار رکعت نماز باجماعت ہو رہی ہو اور ایک شخص اگر آخری رکعت میں بھی شمولیت کرے تو اس کی ساری نماز باجماعت ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی حقیقی عرسوں میں شمولیت اصل میں اصلی عرس ابراہیمی کی شمولیت ہے۔ اسی لئے مدعا یہ ہے کہ وہی کیفیتِ حالیہ پیدا ہو جو ابراہیم علیہ السلام پر طاری ہوئی تھی۔

فرمایا: عرس شریف موہڑہ شریف کو ایک اور خصوصیت بھی حاصل ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ اپنے ساتھیوں کو لے کر پہاڑ پر جا کر اجتماعی دعا کرو۔ معلوم ہوا کہ پہاڑ پر جمع ہو کر دعا کرنے کو قبولیت عطا ہوتی ہے اور یہ خصوصیت بھی موہڑہ شریف کے عرس شریف کو حاصل ہے۔

فرمایا: ہمارے کئی ساتھی یہ شکایت کرتے ہیں کہ عرس شریف کے موقع پر ہجوم کی زیادتی کے باعث ملاقات کا موقع کم ملتا ہے اور پیر صاحب سے دل کھول کر باتیں کرنے کا وقت نہیں ملتا۔ اس لئے اس موقع پر حاضر نہیں ہونا چاہیے

اور فرصت کے اوقات میں آنا چاہیے یہ خیال صحیح نہیں ہے۔اس کی درستی بھی نہایت ضروری ہے۔ بزرگانِ طریقت نے جو دن مقرر فرمائے ہوئے ہیں وہ انوارِالٰہیہ کے نزول کے اوقات ہوتے ہیں اور جو فوائد اور برکات ان ایام میں حاصل ہو سکتے ہیں وہ دوسرے ایام میں ممکن نہیں۔جیسے حج کے ایّام اور مناسک کی ادائیگی کے مقام اور اوقات مقرر کئے گئے ہیں اگرچہ ان ایّام میں بعض لوگوں کو زمین پر سجدہ کرنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔اکثر ایک دوسرے کی پشت پر ہی سجدہ کرنا پڑتا ہے مگر اس وقت اس مقام پر حاضر ہو جانے سے ہی حج ہو جاتا ہے جو کسی دوسری صورت میں ممکن نہیں۔ نیز حدیث میں ہے کہ چالیس سے زیادہ مسلمان جمع ہو کر دعا کریں تو قبولیت ہوتی ہے ایسا کرنا اجابتِ دعا کی شرط ہے۔

زیادہ باتیں کرنے اور زبان سے ٹرٹر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مالک الملک بہترین مہمان نواز ہے وہ دعا کو پہلے قبول فرمالیتا ہے اور بعد میں اس کے رستے میں نکلنے کی توفیق ہوتی ہے۔اس لئے عرس شریف میں حاضری بہت قیمتی ہے۔

فرمایا: عرس شریف میں حاضر ہونے کے آداب سے واقف ہونا ضروری ہے گھر سے روانگی سے پہلے اپنے خیال کو صحیح کریں۔معرفتِ الٰہی کے حصول کا طریقہ سیکھنے اور اپنی رفتارِ زندگی کو صحیح بنانے کی نیت سے گھر سے نکلیں۔ یہی وہ تعلیم ہے جس کے متعلق حکم ہوا **اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ** مکہ شریف سے چین کا دشوار گزار راستہ تقریباً 5000 میل ہے لیکن حصولِ علم کے لئے اس سفر کو بھی اختیار کرنا فرض قرار دیا گیا۔حدیث مبارک میں ہے جو حصولِ علم کے لئے نکلتا ہے ہماری رحمت کے فرشتے اس کے پاؤں کے نیچے اپنے پَر پھیلاتے ہیں اس لئے گھر سے نکلتے وقت صحیح خیال ہونا چاہیے۔

فرمایا: عرس شریف میں حاضری کو نہایت غنیمت سمجھنا چاہیے سو کر اور گپیں ہانکنے میں قیمتی وقت کو ضائع کرنا حماقت ہے۔ ہر لحہ اپنی رفتارِ زندگی کو صحیح کرنے اور ایک دوسرے کی خدمت کرنی چاہیے۔امراء کا فرض ہے کہ وہ اپنے غریب بھائیوں کی خدمت کریں تاکہ ان میں مسکنت پیدا ہو جو موجبِ نزولِ انوارِالٰہیہ ہے۔

فرمایا: شبِ معراج جب حضورﷺ نے مقاماتِ عجیبہ کا ملاحظہ فرمایا تو بہت خوش ہوئے۔پھر مقامِ محمود دیکھا تو بے حد مسرور ہوئے۔ پھر حکم ہوا کہ اس سے بھی اعلیٰ ایک اَور مقام ہے اور اس کا ملاحظہ کروایا گیا۔حکم ہوا کہ یہ مساکین کا مقام ہے۔تو حضور پاکﷺ نے ان کی یہ شان دیکھ کر دعا فرمائی کہ مجھے مساکین میں ہی رکھیو، انہی میں اٹھائیو اور انہیں کے ساتھ حساب کتاب ہو۔عرس شریف میں کثیر تعداد ایسے ہی اصحاب کی ہوتی ہے۔ان سب سے ہمدردی اور مہربانی سے پیش آنا چاہیے۔

فرمایا: عرس شریف کے خصوصی موقع پر خلفاء دربار کا فرض ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کی خدمت کریں۔ شریعت اور طریقت کے مسائل خود سیکھیں اور دوسروں کو سمجھائیں۔ جماعتی تنظیم کے اصولوں پر خود بھی کاربند ہوں

اوراپنے ساتھیوں کو بھی کاربند کریں۔

فرمایا: عرس مادہ ہے جس سے دوسرے الفاظ مثل عروس، عروسیہ، عرائس وغیرہ مشتقات ہیں جیسے ایک گھر میں ایک بچی پیدا ہوتی ہے جو جوان ہوتی ہے اس کی تربیت اور آسائش کے وہاں سامان ہوتے ہیں۔ والدین اور برادران موجود ہوتے ہیں اس کی جب شادی ہوتی ہے اسے اسی گھر سے خزانہ دیا جاتا ہے پھر وہ جب اپنے میکے (اصلی گھر) آتی ہے تو پھر خزانہ دیا جاتا ہے اور یہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسی مناسبت سے مریدین جب اپنے گھر یعنی مقام عرس پر حاضر ہوتے ہیں تو ان کو اصلی نعمت (خزانہ) سے بقدر استعداد حصہ ملتا ہے۔

فرمایا: حضورﷺ غارِ حرا میں اکیلے تشریف لے جاتے تا کہ نوری حقیقت کو حاصل کریں۔ یہ جگہ دشوار گزار ہے۔ وہاں کئی کئی دن بلکہ کئی ہفتے اور مہینے حضورﷺ گوشہ نشینی اختیار فرماتے۔ جب اس ایک ہستی کو نوری حقیقت کا حصول ہو گیا تو جو بھی ان کے ساتھ باتعلق ہوا اس کو بھی اسی نعمت سے حصہ ملتا گیا۔ پھر وہ مجمع کے ساتھ عرفات میں جمع ہوئے اس سالانہ اجتماع کو حج کہا گیا اور عرس اس کی نقل قرار پائی۔

فرمایا: موجودہ زمانے کا المیہ یہ ہے کہ جیسے آجکل کے مسلمانوں نے روزہ، نماز، حج و قرآن وغیرہ کی اصلی غایت بدل دی ہے اور محض رسمی صورت رہ گئی ہے ویسے ہی عرس کا موضوع بھی بدل گیا ہے۔ عرس کا اصلی موضوع یہ تھا کہ نورانی حقیقت کو حاصل کیا جائے۔ اس کی بجائے عموماً اکثر عرس خرافات کا نمونہ بن گئے ہیں۔ ناچ، گانے اور دوسری خرافاتیں ان عرائس کا ضروری حصہ ہو گئی ہیں اور عرس کا اصلی مدعا مفقود ہو گیا ہے۔ لاہور کے چند افراد کا واقعہ بیان فرمایا کہ جب وہ یہاں آئے تو انہوں نے یہاں ذکر کی محفلیں دیکھیں تو واپس چلے گئے کہ موہڑہ شریف میں تو عرس والی کوئی بات ہی نہیں۔ نہ ناچ، نہ گانا اور نہ کوئی اور رنگین پروگرام ہے۔

فرمایا: ایک بیج بویا جاتا ہے تو اس سے پودا اُگ کر ایک درخت بن جاتا ہے تو اس جیسے ہزارہا اور بیج تیار ہوتے ہیں۔ جیسے اخروٹ، بادام کا درخت وغیرہ۔ اسی طرح جو شخص عرس کی حقیقتِ اصلی کے حصول کی خاطر حاضر ہوتا ہے اور اپنی رفتارِ زندگی کو درست کر لیتا ہے تو ایسے انسان کے ساتھ جو بھی صحیح تعلق پیدا کرتا ہے اس کی زندگی بھی بدل جاتی ہے۔ اصحاب کبار کی زندگی ایسی ہی تھی جن کے متعلق حضور پاکﷺ نے فرمایا **هُمْ قَوْمٌ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ** (ان کے پاس بیٹھنے والا بد بخت نہیں رہتا) تو ایسے شخص کو بھی اسی سعادت سے حصہ مل جاتا ہے۔

فرمایا: ایک کپڑا جو میلا ہو گیا ہو اسے صاف کرنا پڑتا ہے اور برتن جس میں صاف اور گندی چیزیں ڈالتے رہیں وہ بھی گندہ ہو جاتا ہے۔ اب اسے صاف کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اسے خالی کیا جائے اور اچھی طرح صفائی کی جائے۔ اسی طرح صاف آئینہ پر گرد پڑ جانے سے مکدر ہو جاتا ہے۔ ضروری ہے کہ اسے بھی صاف کیا جائے۔ جب میلے

کپڑے کو صاف کرنا مقصود ہوتا ہے تو اسے وہاں لے جاتے ہیں جہاں اسے صاف کیا جائے یعنی دھوبی وغیرہ صاف کرتے ہیں۔ وہ خود بخود صاف نہیں ہو جاتا۔

اسی طرح دنیا کے معاملات میں پھنس کر بہ تقاضائے بشریت ہم میں گناہوں کی کدورت آ جاتی ہے۔ ضرورت ہے کہ روزانہ اس کی صفائی کی صورت کی جائے ورنہ کچھ وقفوں کے بعد کم از کم سال میں ایک دو بار تو ضروری ہونی چاہیے۔ اس لئے عرس قائم کیا جاتا ہے تا کہ اپنے گزشتہ گناہوں سے معافی مانگی جائے اور آئندہ کے لئے اپنی رفتارِ زندگی صحیح کر کے اپنے مالک کی غلامی میں بسر کی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ میلے کپڑے پر صابن بھی لگایا جا رہا ہو اور ساتھ ہی مٹی اور غلاظت میں بھی لتھڑا جا رہا ہو کیونکہ ایسی صورت میں وہ کپڑا کبھی صاف نہیں رہ سکتا۔

فرمایا: لوگ عرس شریف پر اپنے اپنے مطالب اور اغراض لے کر آتے ہیں۔ اللہ پاک ان کے دلوں کے خیالات سے خوب واقف ہے۔ جو خیال بھی کوئی لے کر آتا ہے اللہ پاک اس کی افزائش فرماتے ہیں۔ چاہیے کہ انسان صحیح خیال اور صحیح جستجو لے کر آئے، تا کہ اللہ تعالیٰ کا کرم نازل ہو۔

عرس شریف کی حاضری

فرمایا: یہ اجتماع نیک اور اللہ تعالیٰ کے عاشق بندوں کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت اور رضا سب سے اعلیٰ اور اولیٰ چیز ہے۔ آپ یہاں اس لئے جمع ہوتے ہیں کہ اپنے مالکِ حقیقی اور اس کے حبیب پاکﷺ کی باتیں سنیں اور اپنے عقیدے کو درست کریں اور اجتماعی طور پر اللہ تعالیٰ سے اپنے گزشتہ گناہوں سے توبہ کریں اور دعا مانگیں کہ وہ اپنی رضا اور اس پر استقامت عطا فرمائے۔ ہر کام کی توفیق وہی دیتا ہے۔ خدا اور اس کے رسول پاکﷺ کی محبت لے کر اس کے ولی کے مزار پر جمع ہونا ایک اعلیٰ مقصد ہے۔ جو خدا کا صحیح بندہ بنتا ہے وہ کائنات کی تمام موجودات پر حکمران بن جاتا ہے۔ اس کی تمام مشکلات دینی و دنیاوی ختم ہو جاتی ہیں۔

یہاں حاضر ہونے کے لئے تین باتوں کا ہونا ضروری ہے اگر یہ نہ ہوں تو اصلی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ وہ ایسا ہی ہے جیسے کہ ایک پیاسا دریا پر پہنچ کر بھی پانی حاصل نہیں کرتا اور پیاسا ہی واپس آ جاتا ہے۔ وہ محض ایک تماشا دیکھ کر ہی واپس آ گیا۔ وہ تین شرطیں یہ ہیں۔

1۔ جب آپ گھر سے چلیں باوضو ہو کر نیت درست کریں کہ صرف اللہ اور اس کے رسولﷺ کی رضا اور محبت کیلئے میں یہ سفر اختیار کر رہا ہوں اور دوران راہ اس نیت کو حاضر رکھیں۔ ذکر میں مصروف رہیں۔ استغفار کرتے رہیں۔ اگر پارٹی کی صورت میں آنا ہو تو ذکر جہر **(لا الہ الا اللہ)** جاری رکھیں تا کہ اپنی طبیعت بھی حاضر رہے

اور دوسروں کو بھی ترغیب ہو۔ ورنہ دل میں ذکر خدا ضروری جاری رہے۔ راستے میں ہر قسم کی تکلیف کو خدا کی طرف سے سمجھے اور اسے محبوب سمجھے۔اس سے عجیب سرور اور کیف محسوس ہوگا۔

2۔ یہاں پہنچ کر دنیاوی باتوں سے اجتناب کریں۔ خدا کی باتیں اور اس کی یاد میں رہیں۔توبہ کریں۔ ذکر کی کثرت کریں تا کہ یہ تین دن کا چلّہ ہو جائے۔

3۔ جب آپ واپس اپنے گھر میں جائیں تو اس چلّہ کی کیفیت کو قائم رکھیں۔ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائیں اور ہر آزمائش میں اللہ تعالیٰ کے احسان کو یاد رکھیں۔ دنیا اور اس کے کاموں کو زیادہ عزیز نہ سمجھیں۔تندرستی اور بیماری، امارت اور غربت، طاقت اور کمزوری میں بھی آزمائش ہے۔ان آزمائشوں کے پس پردہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے انعام رکھے ہیں۔اللہ تعالیٰ کے احسان کا ہر وقت استحضار رہنا چاہیے۔

فرمایا: اگر آپ اپنے ملازم کو برتن صاف کرنے کے لئے دیں اور وہ برتنوں کو توڑ ڈالے یا مزید گندہ کر دے تو وہ قابل سزا ہوتا ہے یہی حال بندے کا ہے اسے اپنے برتن (قلب) کو ذکر الٰہی اور توبہ سے منور کرنا چاہیے۔ جب آپ خدا کے بندے بن جائیں گے تو تمام تکالیف دور ہو جائیں گی۔اجتماعی دعا اور توبہ زود اثر ہوتی ہے۔

حضرت فضیل بن عیاضؒ جب ڈاکو تھے تو ایک یہودی کا مال بھی ڈاکہ کیا ہوا تھا۔ جب توبہ کی توفیق ملی تو یہودی کے پاس گئے کہ مجھے معاف کر دو۔ وہ مسروقہ مال تو اِس وقت خرُد برُد ہو چکا ہے اور واپس نہیں کر سکتا۔ مگر یہودی نے اپنا مال واپس کرنے کا مطالبہ کیا۔سخت پریشان ہوئے۔ یہودی نے یہ دیکھ کر ایک تھیلی ان کے ہاتھ میں دی اور پھر واپس لے لی۔اسے کھولا تو وہ سونے کی تھیلی تھی۔ یہودی نے نہ صرف اپنے مال کی معافی دے دی بلکہ خود بھی مسلمان ہو گیا۔اس یہودی نے بیان کیا کہ میں نے اپنی کتابوں میں پڑھا ہے کہ جب انسان سچی توبہ کر لیتا ہے تو وہ اگر مٹی کو ہاتھ لگا دے تو سونا بن جاتی ہے۔ میں نے اس تھیلی میں مٹی بھر رکھی تھی۔ جب آپ نے ہاتھ لگایا تو واقعی سونا بن گئی۔ یہ ہے سچی توبہ کی فضیلت۔

عرس شریف کی حاضری کا یہی مقصدِ اولیٰ ہے جہاں اجتماعی دعا اور توبہ ہوتی ہے۔

نوٹ: حضرت فضیل بن عیاضؒ پہلے ڈاکوؤں کے سردار تھے۔ جب توبہ کر لی تو اولوالعزم ولی اللہ بن گئے۔ یہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں تھے۔(مؤلف)

دعااورتوفیق الٰہی

فرمایا: اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی عبودیت، غلامی اور عاجزی کا اظہار اور اپنے مالک کی الوہیت، ربوبیت، قدرت اور رحمت کا اقرار ہی دعا ہے۔

حضورﷺ نے فرمایا:

اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ (ترمذی) ''دعا عبادت کا مغز یا روح ہے''

کیونکہ یہی توحید اور اخلاص کی حقیقت ہے اور توحید اور اخلاص سے بلند تر کوئی عبادت نہیں۔

اَلدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَهِ ''دعا عین عبادت ہے''

حکم الٰہی ہے:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِىٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ط اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِىْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ﴿المؤمن: 60﴾

''تمہارا رب ارشاد فرماتا ہے مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ بے شک جو لوگ میری عبادت سے از راہ تکبر ٹال مٹول کرتے ہیں عنقریب ذلت اور خواری کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے''

دعا کا حکم ہی نہیں بلکہ ترکِ دعا پر شدید وعید سنائی گئی ہے۔

فرمایا: حضورﷺ کا فرمان ہے کہ مومن کی دعا ردّ نہیں کی جاتی۔ فرمایا جب کوئی مومن ایسی دعا کرتا ہے جس میں کوئی گناہ یا باہمی رشتے کاٹنے والی بات نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے تین چیزوں میں سے کوئی ایک چیز عطا فرماتا ہے:

1۔ جو کچھ اس نے مانگا ہے دنیا ہی میں اسے عطا کردے یا اس سے بہتر عطا کردے۔

2۔ اس کا اجر آخرت کے لئے ذخیرہ کردے۔

3۔ جو خیر اس نے مانگی تھی اس کی مثل کوئی شر اس سے دور کردے۔

دعا کی قبولیت اللہ کی حکمت اور بندے کی مصلحت کے ساتھ مربوط ہے۔

فرمایا: قرآن کریم میں ہے:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴿الاعراف:180﴾

''اور خدا کے سب نام اچھے ہی اچھے ہیں تو اس کو اس کے ناموں سے پکارا کرو''

ہر اسمِ الٰہی کے لئے ایک ''موضوع'' ہوتا ہے اور ایک ''موضوع **لَهٗ** ''۔اللہ تعالیٰ ہماری نظروں سے غائب اور ہمارے وہم وگمان اور قیاس وخیال سے بالاتر ہے۔ہم اسے اس کی صفات سے پہچانتے ہیں۔عالمِ مخلوق اس کی صفات کا مظہر ہے اور ہر صفت کو عالمِ خلق پر لانے کے لئے ایک خادم فرشتہ مقرر ہے جس کے ماتحت بھی بلند رتبہ فرشتے ہوتے ہیں اور ان کے ماتحت اور بے شمار فرشتے ہیں۔بلند مرتبہ فرشتے ان ملائکہ کے مالک وحاکم ہوتے ہیں جب ایک ذاکر کسی اسمِ الٰہی کا ذکر کرتا ہے تو اس اسم کی برکت سے اجابت کا دروزاہ کھلتا ہے۔ ہر ایک اسمِ الٰہی کے جدا جدا اعداد ہیں اور ان اعداد کی تعداد قاعدے کے مطابق پڑھنے کی اس کا شیخ اجازت دیتا ہے۔اسمِ الٰہی کا حسبِ ہدایت پڑھنا دعا کی مقبولیت کا باعث ہوجاتا ہے۔اسمِ الٰہی کے ورد یا ذکر میں اعداد کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔مقررہ تعداد سے کم یا زیادہ پڑھنے سے ثواب تو لازمی ہوتا ہے لیکن مقررہ تعداد میں پڑھنے سے اجابت کا مطلب حاصل ہوتا ہے۔

فرمایا: مخلوق کے اندر چاہے وہ ہندو ہو یا سکھ،عیسائی ہو یا یہودی اور خواہ مسلمان ہو اپنے مالک کی الفت اس کے دل میں موجود ہے۔اسی لئے وہ اپنی اپنی زبان اور اپنے اپنے خیال کے مطابق خدا کو یاد کرتا ہے اور اس کا نام لیتا ہے اور خداوند کریم ان سب کو جانتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ دنیا میں اٹھارہ ہزار زبانیں ہیں اور خداوند کریم ان سب کا عالم اور جاننے والا ہے۔الغرض خدا کا نام لینا چاہیے خواہ کسی زبان میں ہو۔وہ خدا کا نام بہر حال حروف میں ہوگا۔چنانچہ ان حروف سے کلمات بنتے ہیں اور حروف میں اللہ تعالیٰ نے بہت اسرار رکھے ہیں جو پوشیدہ ہیں اور ان حروف کے خدام پیدا کئے ہیں جن کا مقام عرشِ معلّٰی کے قریب ہے۔

سمجھانے کے لئے فرمایا **لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ** کے بارہ حروف ہیں اور مطابق ان اعداد کے یعنی ان کی تعداد کے برابر اللہ تعالیٰ نے بارہ بروج پیدا کئے ہیں۔چونکہ ان حروف کا پیدا کرنے والا پروردگارِ عالم ہے تو وہ خدام جو ان حروف کے ہیں جب کوئی اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر کرتا ہے یا سوال کرتا ہے تو ان کلمات کے خدام اس ذکر یا سوال کو پروردگارِ عالم کے سامنے پیش کرتے ہیں جو مجیب الدعوات ہے۔

عصر حاضر اور تبلیغ دین

فرمایا: موجودہ زمانے میں لوگوں کو دین کا شوق نہیں ہے اور جہالت بہت زیادہ ہے۔کیا بڑے لوگ اور کیا عوام دین کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ اکثر جہالت کی باتیں بناتا ہے۔بعض مولوی صاحبان

انہیں اصلیت کا پتہ نہیں دیتے بلکہ وہ اپنی فرقہ بندیوں کی وجہ سے ایک دوسرے کو لایعنی فتوؤں میں الجھاتے ہیں اور آئے دن کوئی نہ کوئی نیا شاخسانہ موجود ہوتا ہے۔ یہ تمام فرقہ بندیاں محض پیٹ کی خاطر (نفسانیت) اور باہمی عناد اور ضد بازی کی وجہ سے ہیں۔ ورنہ دین اسلام اصل میں ایک ہی دین ہے یعنی اسوۂ حسنہ اختیار کرنا، حضور پاکﷺ کی پیروی اور تابعداری۔ علماء اور مشائخ کا فرض ہے کہ وہ پہلے اپنے آپ کو اور پھر مخلوقِ خدا کو اسی اسوۂ حسنہ پر قائم کریں اور دین میں تفرقے نہ ڈالیں۔ کیونکہ اس وجہ سے لوگوں کی دین سے محبت کی بجائے دین سے دوری ہوتی جارہی ہے اور سارا معاملہ الٹ ہورہا ہے۔

فرمایا: حضور پاکﷺ نے عالم انسانیت کو ایک ہی تعلیم دی ہے اور اسی پر قائم رہنے کی تاکید کی ہے۔ آخر سوچنے کی بات ہے کہ حضور اکرمﷺ کے زمانے میں صحابہ کرامؓ میں کیوں فرقے موجود نہیں تھے۔ تمام صحابہ کرامؓ ایک ہی دریائے نور میں نورانی مچھلیوں کی طرح تیرتے تھے اور ماسویٰ اللہ کی آلائش سے پاک تھے۔ وہ ایک ہی مرکزِ حقیقت پر قائم تھے جو کہ نسبت رسولﷺ کا مرکزی اور حقیقی دائرہ ہے۔ خلفائے راشدینؓ کے دور میں یہی کیفیت قائم رہی۔ چنانچہ دورِ حاضر میں اہم ترین ضرورت یہی ہے کہ امتِ مسلمہ کو اسی مرکزِ حقیقت کی طرف دعوت دی جائے۔ کیونکہ امتِ مسلمہ کی موجودہ اصلاح اسی اصول پر ممکن ہے جو طریقہ شروع اسلام میں حضورﷺ نے اختیار فرمایا۔ نبی پاکﷺ نے صحابہ کرامؓ کی اصلاح اور تعلیم و تربیت نسبت رسولﷺ کی بنیاد پر کی اور بقول حضرت امام مالکؒ

لَنْ يُّصْلِحَ آخَرَ هٰذِهِ الْاُمَّةَ اِلَّا مَا اَصْلَحَ اَوَّ لُهَا

''اس امت محمد یہ کے آخر میں آنے والے لوگوں کی ہرگز اصلاح نہیں ہوسکتی۔ جب تک وہی طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس نے ابتدا میں اصلاح کی ہے''

فرمایا: رسولِ خداﷺ کا فرمان ہے۔

بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ كَانَ بِاٰيَةٍ

''میری طرف سے دوسروں کو پہنچاؤ اگرچہ وہ ایک آیت ہی ہو''

نیز ارشاد فرمایا ''خدا اس بندے کو آباد کرے جس نے میری باتوں کو سنا اور دوسروں تک پہنچایا''

لہٰذا یہ خیال رکھنا چاہیے کہ یہ تبلیغی فرض ادا کرتے وقت جس عقل و دانش کا انسان ہو اسی معیار کے مطابق اس سے گفتگو کی جائے۔ رسول خداﷺ کا فرمان ہے:

كَلِّمُوْا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عَقُوْلِهِمْ

''لوگوں کی عقل کے معیار کے مطابق ان سے بات کرو''

مخاطب کی سمجھ کے مطابق اور ممکن ہو تو اس کے ماحول اور اس کی زبان میں بات کی جائے تا کہ اس کی سمجھ میں اچھی طرح آ جائے۔ مقصد اسے صحیح علم سکھانا ہو نہ کہ اپنی علمی فوقیت ثابت کرنا ہو۔

فرمایا: اللہ تعالیٰ کا راستہ لوگوں کو بتانا اور پھر مخلوقِ خدا سے **تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ** کے مطابق برتاؤ کرنا اصل چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا راستہ بتانا محض خوشنودیِ الٰہی حاصل کرنے کیلئے بڑی اعلیٰ خدمتِ خلق ہے۔ اس راستے کی تلقین اپنے آپ کیلئے بھی نہایت مفید اور ضروری ہے۔ اسی سے نسبتِ دوام حاصل ہوتی ہے اسی سے دین کی سمجھ اور نشر واشاعت تیز ہو جاتی ہے۔

فرمایا: آج کل سلوک اور طریقت کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ عام طور پر جہلا اکٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر اصحاب بزرگوں کی چند کتابیں پڑھ کر سطحی واقفیت حاصل کر لیتے ہیں اور چند دینی اصطلاحات اور دل پسند واقعات بطور کرامت یاد کر لیتے ہیں۔ خود غیر تربیت یافتہ ہونے کی وجہ سے دین کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ مگر وہ لوگوں پر غلط اثر ڈالنے میں کوشاں رہتے ہیں اور سادہ لوح لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور جو انہیں صحیح بات بتانے کی کوشش کرے اس سے وہ الجھتے ہیں۔ خود صحیح علم سیکھ کر دوسرے لوگوں کو صحیح علم سکھانا بڑی خدمت ہے اور بہت ضروری ہے۔ نیز یہ تعلیم حضور اکرمﷺ کے حکم کے مطابق **كَلِّمُوْا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عَقُوْلِهِمْ** ہونی چاہیے۔ سبزی کی خواہش کرنے والوں پر ہیرے اور جواہرات نہیں پھینکے جاتے۔ اَن پڑھ اور دہقانی لوگوں کے سامنے حکمت اور فلسفہ کی باتیں نہیں کی جاتیں وہ تو معقول بات کو عموماً نہیں سمجھ سکتے۔ جتنی عقلی اور تعلیمی معیار کا کوئی طبقہ یا شخص ہو اس کے عقلی اور تعلیمی معیار سے تھوڑا سا اونچا رہ کر بات کرنا چاہیے۔ اگر ممکن ہو تو ان کی زبان اور ان کے ماحول سے مثالیں دے کر سمجھایا جائے تا کہ انہیں اچھی طرح سمجھ آ جائے۔ ایسی باتوں کا اثر جلدی ہوتا ہے۔ تبلیغ کرتے وقت صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ملحوظ ہو ذاتی مفاد مدِنظر نہ ہو۔ دین کی تبلیغ ہمیشہ نرمی، شفقت، محبت اور خوش اسلوبی سے ہونی چاہیے۔ دوسرے کے جذبات اور اس کی عزتِ نفس کا خیال ضروری ہے۔

فرمایا: تبلیغ بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ تبلیغ ہمیشہ سمجھ بوجھ کر کرنی چاہیے۔ سُنی سنائی اور غیر تحقیق شدہ باتوں کی بنیاد پر کبھی تبلیغ نہ کرے۔ اُس بات کی تبلیغ کرے جو قرآن اور سنت کے مطابق ہو اور وہ بات کہے جس کا خود اچھی طرح سے واقف ہو اور اس کا عامل بھی ہو اور محض رضائے الٰہی کیلئے ایسا کرے۔ اپنی بڑائی یا علمی فوقیت ہرگز مقصود نہ ہو اور خوش اخلاقی کو ملحوظ رکھے۔ اکثر مولوی صاحبان بات بات پر الجھتے ہیں۔ خود بھی مغالطے میں ہیں اور دوسروں کو بھی مغالطے

میں ڈالتے ہیں۔ حضرت پیر صاحبؒ نے تبلیغ دین کے اپنے چند واقعات بیان فرمائے چنانچہ ایک واقعہ درج ذیل ہے۔

فرمایا: ایک دفعہ میں خان بہادر راجہ فضل الٰہی صاحب کے مکان واقع مری روڈ راولپنڈی میں مقیم تھا کہ مجھے کچھ عرصے کیلئے تخلیہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں بغیر کسی کو اطلاع کئے راولپنڈی شہر کے بڑے امام باڑہ کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد میں چلا گیا جس کے ملحقہ ایک مزار تھا۔ راجہ صاحب میری بہت تلاش کرتے رہے۔ مگر انہیں میں نہ مل سکا۔ جب کسی نے ذکر کیا کہ میں موہڑہ شریف چلا گیا ہوں تو وہ خاموش ہو گئے۔ اس مسجد کی گلی میں ایک سکھ پھل کی ریڑھی والا آتا تھا۔ اس سے میں نے طے کر لیا کہ وہ روزانہ ایک عدد کیلے کی پھلی رکھ جایا کرے جس سے روزانہ روزہ افطار کر لیتا تھا۔ ملحقہ مسجد میں اہل حدیث مولوی صاحبان جمع ہوتے اور وہ پیرانِ کرام کے خلاف بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے۔ شرک، کفر اور بدعت کی تمام باتیں پیرانِ کرام سے منسوب کرتے۔ میں خاموشی سے سنتا اور اپنے کام میں مشغول رہتا اور بوقتِ نماز خاموشی سے مسجد میں نماز ادا کر لیتا۔

ایک دن دو مولوی صاحبان ایک مسئلے میں الجھ گئے اور لال پیلے ہونا شروع کر دیا۔ ایک مولوی صاحب نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے ٹھیک کہا ہے نا؟ میں نے کہا غلط ہے۔ دوسرے نے مسرت سے کہا کہ میں نے ٹھیک کہا ہے نا؟ میں نے اسے بھی کہا غلط ہے۔ یہ ان کے لئے ایک اچنبے کی بات تھی۔ انہوں نے مجھ سے مسئلہ پوچھا تو میں نے خوش اسلوبی سے بیان کیا۔ وہ دونوں سمجھ گئے اور خوش ہوئے۔ مگر ان کو زیادہ حیرانی اِس بات پر ہوئی کہ میں پڑھا لکھا بھی ہوں کیونکہ ان کا میرے متعلق زعم تھا کہ میں جاہل مطلق ہوں اور مزار پر بیٹھا رہتا ہوں۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ انہوں نے مجھ سے دیگر مسائل پوچھنے شروع کر دیے جن کا میں تسلی بخش جواب دیتا۔ وہ بہت متاثر ہوئے اور ان کا پیرانِ عظام کے متعلق نقطہ نظر تبدیل ہو گیا۔ انہی دنوں راجہ فضل الٰہی صاحب اپنے تانگے میں سوار اسی راستہ سے گزرے۔ میں اتفاقاً مسجد میں کھڑا تھا۔ جوں ہی انہوں نے مجھے دیکھا وہ دوڑتے ہوئے میرے پاس آئے اور پکارا ''پیر صاحب، پیر صاحب'' ہم آپکو کئی روز سے تلاش کر رہے ہیں کسی نے بتایا تھا کہ آپ موہڑہ شریف چلے گئے ہیں مگر آپ تو یہاں موجود ہیں۔ اس وقت ان اہلحدیث مولوی صاحبان کو معلوم ہوا کہ میں ہی موہڑہ شریف کا پیر ہوں۔ وہ اپنی گزشتہ کاروائی پر سخت نادم ہوئے اور معافی کے خواستگار ہوئے۔ راجہ صاحب مجھے اپنے تانگے میں بٹھا کر اپنے مکان پر لے آئے۔ مولوی صاحبان نے موہڑہ شریف حاضر ہونے کی اجازت مانگی۔ چنانچہ وہ فرداً فرداً موہڑہ شریف حاضر ہوئے اور بیعت ہوئے اور طریقت نسبت رسولیﷺ میں داخل ہوئے۔ ان کی وجہ سے کئی اور اصحاب بھی تشریف لائے اور بیعت ہوتے رہے۔ اس طریقہ تبلیغ میں بہت سے اسباق ہیں۔ اہم سبق تو یہی ہے کہ سمجھ سے کام لے کر تبلیغ کرنا چاہیے۔

صراطِ مستقیم

اعلیٰ حضرتؒ نے نقشہ بنایا۔

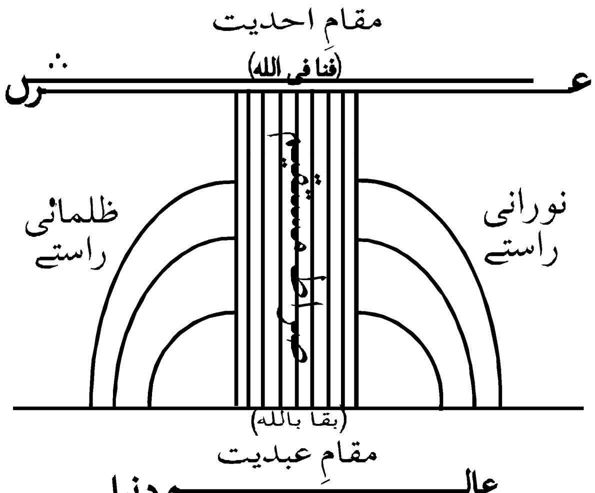

فرمایا: جب انسان اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور راہِ سلوک طے کرنے لگتا ہے تو اسے بے شمار وسوسے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس نقشہ کے نچلے حصے میں عالم دنیا اور انسان اور ایک بڑا راستہ (صراطِ مستقیم) ہے جو ذاتِ احدیت کی طرف جاتا ہے۔ اس بڑے راستے کے دائیں بائیں مختلف راستے ہیں۔ دائیں طرف کہیں علم، کہیں مکاشفہ، کہیں شیئون و اعتبارات کہیں کرامات وغیرہ (نورانی راستے) اور بائیں طرف دنیاوی عیش وعشرت، لذات نفسانی کے ظلمانی راستے ہیں۔ لیکن سیدھا راستہ جو اوپر کی طرف جاتا ہے اور جو ذات احدیت (اللہ) کی طرف رخ رکھتا ہے وہی سیدھا راستہ صراطِ مستقیم ہے۔ بائیں طرف کے راستے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جونہی ایک انسان اس راستے پر چلتا ہے اور کچھ ترقی کرتا ہے تو کوئی نہ کوئی خواہشِ نفسانی ابھرتی ہے جسے شیطان **مُزَیَّنْ** کر کے پیش کرتا ہے اور وہ انسان اس میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس شیطانی وسوسے سے پھسل کر وہ پھر اپنی پہلی جگہ پر گر پڑتا ہے بلکہ بسا اوقات اس سے بھی اسفل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح دائیں طرف کے راستے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ جب صراطِ مستقیم پر چلنے سے اس میں نورانیت پیدا ہونی شروع ہوتی ہے اور سلوک میں کوئی مقام حاصل کرتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی کوشش سے یہ مقام حاصل کر لیا ہے تو وہ غافل ہو جاتا ہے اور اسی مقام پر رک جاتا ہے اور وہیں ٹھہرا رہتا ہے اور مزید راستہ طے کرنے کا خیال بھول جاتا ہے (ایسے لوگ عموماً مجذوب ہوتے ہیں) ان کا حال تو ایسا ہے کہ لاہور سے موہڑہ شریف آنے کے لئے گاڑی میں بیٹھ گئے مگر راستے میں کسی جگہ مثلاً جہلم، گاڑی سے اتر گئے اور وہیں رک گئے تو ایسے لوگ کبھی بھی موہڑہ شریف نہیں پہنچ سکتے بلکہ بسا اوقات اپنی مزید غفلت کی وجہ سے حاصل کردہ نورانیت سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

اسی لئے سالک کو گزشتہ ساعت پر غور کرتے رہنا چاہیے اور اپنی غفلت پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی چاہیے اور توبہ کرکے اپنے ارادہ کو مضبوط کر لینا چاہیے۔ ذکرِ الٰہی ہمہ وقت اور ہر حال میں دل میں قائم رہنا چاہیے اور مختلف شیون اور مختلف چیزوں پر توجہ نہیں کرنی چاہیے۔ توجہ صرف اللہ کی ذات کی طرف ہی رکھنی چاہیے۔ یہ راستے کی چیزیں محض دل بہلاوے ہیں۔ انسانی زندگی صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی اور غلامی کے لئے ہے۔ اسبابِ زندگی محض قیامِ زندگی کے لئے ہیں تو ایسا شخص اپنی منزل مقامِ احدیت پر پہنچ جاتا ہے۔

فرمایا: وہ خوش قسمت انسان جو عرشِ عظیم (مقامِ احدیت) تک پہنچ جاتے ہیں اور فنافی اللہ کا مقام حاصل کر لیتے ہیں مگر فنائیت مرتبہ ٔ کمال نہیں۔ جیسے اسلام سے قبل ادیانِ عالم مثل یہودیت، عیسائیت وغیرہ نے سمجھا۔ اُن میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ دین اسلام اور اُمتِ محمدیہ کی خدمت کے لئے مامور فرماتا ہے اور پھر انہیں ہر گروہ کو راہِ حق کی دعوت دینے کے لئے انہی جیسا بننا پڑتا ہے۔ ایسے اصحاب اپنے بلند مقام سے نزول کرکے اور تخلّق باخلاق اللہ سے مزین ہوکر مقامِ عبدیت پر پہنچ جاتے ہیں جو بقاباللہ کا مقام ہے اور وہاں انہی لوگوں میں رہ کر ان ہی جیسی ظاہریت اختیار کرکے ان میں سے شائقین راہِ حق کو آہستہ آہستہ محبت اور حکمت سے شاہراہِ توحید پر چلاتے ہوئے ذاتِ باری کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہی اولیاء اللہ کا مقامِ ارشاد ہے اور یہی ان کا مسئلہ ھبوط ہے۔

مسئلہ تقدیر اور انسانی عمل

فرمایا: پنڈی گھیپ سے چند مولوی صاحبان نے ایک خط لکھا جس میں انہوں نے تقدیر اور انسانی عمل کے مسئلے پر بحث کی ہے اور کہا ہے کہ جب تقدیر ہے تو عمل کی کیا ضروری ہے اور اگر عمل ہے تو تقدیر مہمل۔ پھر ڈاکٹر اقبال کے اس مصرع کو کہ:

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہ محض غلط ہے وغیرہ، وغیرہ۔ ایک طولانی خط ہے۔

فرمایا: ہر انسان اپنے محدود دائرے میں ہے۔ مولوی صاحبان بھی اپنے اپنے محدود دائرے میں ہیں۔ ایک نقشہ بنایا، جس میں چھوٹے بڑے دائرے بنائے اور ان تمام دائروں کو محیط ایک بڑا دائرہ بنایا۔

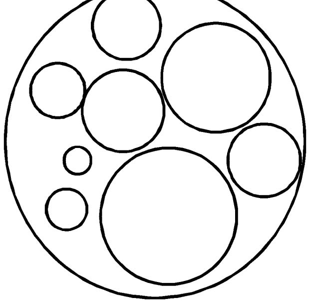

ہر فرد اپنے محدود دائرۂ علمی کے مطابق بات کرتا ہے اور بات سمجھتا ہے۔ بعض مولوی صاحبان نے جن کا اپنا علم جزوی تھا ضخیم کتابیں اسی مسئلہ پر لکھ ڈالیں۔ نہ صرف یہ بلکہ دو مذہب قدریہ اور جبریہ رائج ہو گئے اور ہزارہا مخلوقِ خدا کو مغالطہ میں ڈال دیا۔ نہ صرف وہ خود مغالطے میں تھے بلکہ اوروں کے بھی مغالطے کا باعث بن گئے۔

مسئلہ صرف اتنا ہے کہ جو کچھ ان چھوٹے چھوٹے دائروں میں ہو رہا ہے وہ سب اس بڑے دائرے میں محیط ہے جیسے چمکتا ہوا سورج ہو اور دن کے بارہ بجے ہوں تو اس وقت کوئی مریض کا علاج کرتا ہے۔ کوئی قتل کرتا ہے۔ کوئی کسی کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ تو کوئی کسی کی راحت کا سامان کرتا ہے۔ یہ سب کچھ سورج کی روشنی کے بڑے دائرے میں ہو رہا ہے۔ مگر وہ ان باتوں کی مانع نہیں ہے۔ اس طرح چھوٹے چھوٹے دائروں میں وقوع ہونے والی تمام باتیں بڑے دائرے کی وسعت میں موجود ہیں اور اس کی وسعت ان کی مانع نہیں ہے۔ لہٰذا وہاں عمل بھی ہے۔ عمل کا ہونا جزا و سزا بھی تقدیر کے دائرے میں ہے۔ تقدیر سے باہر کوئی چیز نہیں ہے یہ دونوں ایک دوسرے کی مانع نہیں۔ یہ باتیں جزوی علم رکھنے والوں کی بتائی ہوئی ہیں اب اس دائرے کی وسعت صرف ان اصحاب کو حاصل ہے جو **الواسع** اور **المحیط** ذات کے ساتھ قرب رکھتے ہیں۔ جتنا قربِ ذاتی زیادہ ہوگا اتنا ہی ان کی وسعتِ علمی زیادہ ہوگی اور جتنی دوری ہوگی اتنی ہی ان کی وسعتِ علمی محدود ہوگی۔

ذرا غور کریں۔ پرائمری سکول کے تعلیم والے کالج اور یونیورسٹی والوں کے مقابلہ میں کیا وسعتِ علمی رکھ سکتے ہیں۔ یا ایک چپڑاسی تحصیلدار کا ہے اور دوسرا چپڑاسی صدرِ مملکت کا ہے تو دونوں کی وسعت معلومات میں کتنا نمایاں فرق ہوگا۔ تحصیلدار کا چپڑاسی زیادہ سے زیادہ تحصیل کا دورہ کر سکتا ہے اور صدرِ مملکت کا چپڑاسی سارے ملک کا بلکہ دیگر ممالک کا بھی دورہ کر سکتا ہے بلکہ صدرِ مملکت کے اندرونی اور بیرونی حالات سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ **الواسع** اور **المحیط** ذات سے قرب حاصل کیا جائے تو وسیع علم حاصل ہوگا اور وہ ذات چونکہ "**مُحِیْطٌ بِکُلِّ شَیْءٍ**" ہے ایسے شخص کا علم بھی محیط ہوگا۔

فرمایا: ایک روز رسول خدا ﷺ مسجد نبوی میں تشریف لائے اور ان کے دائیں ہاتھ میں ایک کتاب تھی اور بائیں ہاتھ میں دوسری کتاب تھی اور فرمایا: "لوگو! جانتے ہو کہ ان کتابوں میں کیا ہے؟" اصحابِ کرام رضوان اللہ علیہم نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ میرے دائیں ہاتھ میں جو کتاب ہے اس میں ان تمام لوگوں کے نام درج ہیں جو ازل تا روزِ قیامت اللہ کے پیارے ہیں اور وہ بہشتی اصحاب ہیں اور دوسری کتاب میں تمام دوزخی اصحاب کے نام درج ہیں۔ اس پر اصحابؓ نے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ اگر یہ نام پہلے سے درج

شدہ ہیں تو ہمیں دین کی خاطر جہاد میں اپنی جانیں پیش کرنے، نمازیں پڑھنے، زکوۃ دینے، روزے رکھنے اور حج وغیرہ احکام کے بجالانے میں جو تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں وہ ہم کیوں کریں؟''

حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ جو میں نے بتایا وہی صحیح ہے آپ ایسا کوئی کام نہ کریں اور جیسا چاہیں کریں۔

چنانچہ تمام لوگ مسجد سے چلے گئے۔ جب نماز کا وقت ہوا اور حضرت بلالؓ نے اَذان شروع کی **حَیَّ عَلٰی الصَّلٰوۃ** کہا تو لوگ اُفتاں وخیزاں دوڑتے ہوئے مسجد میں جمع ہوگئے۔ جب سب جمع ہوگئے تو رسول خدا ﷺ نے پوچھا کہ کیوں آئے؟ سب نے جواب دیا کہ ہم نہیں جانتے۔ جب اَذان کی آواز کان میں پڑی تو ہم بےقرار ہوگئے اور دوڑتے ہوئے یہاں پہنچ گئے اور اس وقت مسجد کے سوا ہمیں دوسری جگہ قرار نظر نہ آیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہی تقدیر ہے اور تمہارے یہ اعمال بھی تقدیر کے ماتحت ہیں۔ انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ اپنے اختیار کے مطابق نیک عمل کرے اور اسی بنا پر اس کی جواب دہی ہوگی۔

فرمایا: اس واقعہ سے مشیئت ایزدی کا پتہ چلتا ہے اور اسی ہی سے انسان کو عالمِ اسباب کا ثبوت ملتا ہے عالمِ اسباب اور عمل ہی سے انسان جنت یا جہنم کا حقدار ہوتا ہے۔ انسان کو عالمِ اسباب ہی سے کام لینا ہے کیونکہ مشیئت ایزدی عالمِ اسباب میں مستور ہے اور عالمِ اسباب مشیئت ایزدی کے ماتحت ہے۔

ریلوے ٹرین کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ وہ ایک پٹڑی پر جا رہی ہے اگر اسے دوسری پٹڑی پر لے جانا مقصود ہو تو دنیا جہاں کے علما دعائیں کرتے رہیں کہ وہ خود بخود دوسری پٹڑی پر چلی جائے تو یہ نہیں ہو سکے گا۔ مگر ایک اَن پڑھ، جاہل کانٹے والا اس کا کانٹا بدل کر دوسری پٹڑی پر لے جائے گا کیونکہ کانٹے کا بدلنا اس کی تقدیر ہے۔

قرآن مجید اور موجودہ علوم

فرمایا: فوج کے ایک کرنل صاحب امریکہ جاتے ہوئے ملاقات کیلئے آئے اور کہا کہ میں امریکہ اس لئے جا رہا ہوں کہ وہاں اعلیٰ ٹریننگ حاصل کروں گا۔ میں نے دریافت کیا کہ ایسی ٹریننگ کا انتظام ہمارے ملک میں کیوں نہیں ہو سکتا؟ وہ کہنے لگا کہ اسلامی ممالک کے لوگ تو مذہب کے پیچھے پڑے رہے اور دوسری اقوام سائنسی علوم میں ترقیاں کرتی رہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان ذلیل وخوار ہوگئے اور اتنے پس ماندہ ہوگئے ہیں کہ ہر معاملے میں انہی کے دست نگر ہوگئے ہیں اور وہ اقوام بامِ عروج پر پہنچ گئی ہیں حالانکہ وہ دین اسلام کے سخت مخالف ہیں۔

فرمایا: اس کا یہ خیال غلط ہے مجھے بڑا خیال پیدا ہوا کہ یہ سارا اثر مغربی تعلیم کا ہے اور یہودی لابی نے ایسے خیالات مسلمانوں کے دلوں میں پیدا کر رکھے ہیں جو تاریخی لحاظ اور قرآنی رو سے غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ

سائنسی ترقیوں کی ساری بنیاد اسلامی سائنسدانوں کی کاوش کی بنا پر ہے۔فرق یہ ہے کہ مغربی اقوام گزشتہ چند صدیوں سے اپنی پیہم محنت اور فکر و تدبر سے ترقی کرتی رہیں اور مسلمان اسی دوران اپنی کاہلی اور غفلت کا شکار ہو گئے۔اگر ہم تجزیہ کریں تو موجودہ سائنسدانوں نے کوئی ایسی ترقی نہیں دکھائی جس کی بنیاد قبل ازیں موجود نہ ہو بلکہ بعض ایجادوں کا پتہ قبل از اسلام دَور میں بھی ملتا ہے۔

مثلاً کہا جاتا ہے کہ بم، ہوائی جہاز، ریڈیو، ایٹم بم وغیرہ موجودہ سائنسدانوں کی دریافت ہے۔اہل علم کو اس بات کا علم ہے کہ اِن چیزوں کی ایجاد گزشتہ ایک سو سال کے عرصہ میں ہوئی ہے مگر ابن خلدون اور دوسری معتبر تاریخیں ان باتوں کا پتا سینکڑوں سال پہلے دیتی ہیں مثلاً بم کی ایجاد بقراط کے زمانے میں موجود تھی اور وہ ایسے بم تھے جو زمین پر مارے جاتے تھے اور وہی بم دشمن فوج کی جگہ پر زمین سے جا کر نکلتے اور اسے تباہ کر دیتے۔

موجودہ راڈار (RADAR) کی جگہ جمشید بادشاہ کے پاس ایک پیالہ کی صورت میں موجود تھا جسے ''جامِ جم'' کہتے تھے اور وہ صبح تمام موجود دنیا کے حالات اس پیالہ میں دیکھ لیتا تھا اور پھر کاروبارِ سلطنت شروع کرتا تھا۔

اسی طرح سکندر کے پاس آئینہ تھا جس میں وہ تمام دنیا کے حالات دیکھ لیتا تھا۔اسی طرح ہوائی جہاز کا ذکر کتابوں میں پہلے سے مذکور ہے۔ثابت ہوا کہ موجودہ سائنسدانوں نے نئی قسم کی کوئی بات پیدا نہیں کی البتہ پرانی صورتوں کو ہی آگے بڑھایا ہے۔چنانچہ اب یہ تسلیم کیا جا رہا ہے کہ موجودہ سائنس کی ساری ترقی انہی بنیادوں پر استوار ہو رہی ہے جو مسلمانوں نے پہلے فراہم کر دی تھیں۔

قرآن مجید نے بموں، ہوائی جہازوں، خلائی جہازوں وغیرہ کے متعلق گواہی دی ہے جیسے سورۃ الرحمٰن میں تانبے اور لوہے کے بم برسائے جانے اور خلائی مقامات میں پہنچنے کا ذکر موجود ہے۔ہر صدی کی جو نئی چیز بھی آتی ہے اور اس کا علم ہوتا ہے جب ہم قرآن مجید کو غور سے دیکھتے ہیں تو وہ چیز وہاں پہلے سے مذکور پاتے ہیں۔ہمارا تجربہ ہے کہ قرآن حکیم میں غور و فکر سے بہت سی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔چنانچہ سورج، چاند اور ستاروں کی تسخیر کا ذکر ہے۔جہاں وہ ہمیں خود بخود اتنے فائدے پہنچاتے ہیں وہاں انسان اپنی عقل و دانش سے ان سے مزید بہت سے کام لے سکتے ہیں۔ آسمانی اور زمینی امور میں غور و فکر کرنے والوں کی قرآن مجید میں تعریف فرمائی ہے اور وہ اسی لئے ہے کہ ایسے ہی لوگوں کیلئے تسخیرِ کائنات کی راہیں پیدا ہوتی ہیں۔جتنی باتیں ہمارے سامنے آ چکی ہیں مثلاً چاند اور دیگر مقامات پر انسان کی رسائی ظاہر کرتی ہے کہ یہ تمام مقامات اس کی زد میں ہیں اور اس کی رسائی میں آ سکتے ہیں۔غرض قرآن مجید میں وہ تمام علوم اور احوال درج ہیں جو قیامت تک پیش آنے والے ہیں۔غور و تعمق شرط ہے۔

فرمایا: قرآن حکیم میں اوّلین وآخرین کے تمام علوم موجود ہیں اور یہ خیال پیدا نہ ہو کہ اوّلین میں ایسے لوگ موجود ہی نہ تھے جو اس آنے والے واقعات اور عجائبات کا علم رکھتے تھے۔ یہ غلطی ہے اُس وقت بھی ایسے لوگ موجود تھے جو آنے والے واقعاتِ عالم کو بصیرتِ نوری سے جانتے تھے اور اس کا یقین رکھتے تھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

جَمِيْعُ الْعِلْمِ فِى الْقُرْاٰن وَلٰكِنْ تَقَاصَرُ عَنْهُ اِفْهَامُ الرِّجَالُ

''تمام علوم قرآن مجید میں موجود ہیں لیکن لوگوں کے ذہن اُن کے سمجھنے سے قاصر ہیں''

چنانچہ موجودہ زمانے کی تمام ایجادات کا ذکر بھی موجود ہے اور جو ابھی تک ظہور میں نہیں آیا وہ بھی اس میں موجود ہے۔ مگر یہ تفکر و تدبر کرنے والوں کو معلوم ہوسکتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ جیسے ایک درخت ہو جس کی شاخیں موجود ہوں اور ایک شخص جس نے اس کے پتے اور پھول نہ دیکھے ہوں تو اسے پھولوں اور پتوں کی سمجھ نہیں آسکتی۔ اس کے بعد دوسرے شخص کی زندگی میں پتے اور پھول نمودار ہوں تو دوسرا شخص باآسانی سمجھ سکتا ہے۔ اگر تیسرے شخص کی زندگی میں پھل آجائے تو اسے درخت کے پتے، پھول اور پھل بھی سمجھ آجائیں گے۔ ویسے ہی ان اصحاب نے جب قرآنی آیات متعلقہ مابعد الطبیعاتی علوم پڑھیں تو انہوں نے اپنی سمجھ کے مطابق تاویل کی مگر وہ صحیح نہ تھی حالانکہ وہ اپنی جگہ پر حقیقت تھی۔ اگر کوئی بات کسی کی سمجھ میں نہ آسکے تو اس بات کے نفس حقیقت میں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی چیز کے متعلق عدم واقفیت کی بنا پر اس کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جو نئے نئے علوم سامنے آتے جا رہے ہیں وہ سبھی قرآن مجید کے جزو ہیں اور وہ بتدریج اس میں مندرج نظر آتے ہیں۔ اسی روشنی میں سابقین کی تفاسیر کو سمجھنا چاہیے۔

فرمایا: قرآن حکیم کی تعلیم ہمارے لئے بلکہ قیامت تک آنے والی تمام نسلِ انسانی کیلئے مکمل دستور حیات ہے۔ تمام ادیان جو اس سے قبل آئے وہ جزوی تھے اور نبوتیں بھی جزوی اور رسالتیں بھی جزوی تھیں۔ رسالت تامہ حضور اکرمﷺ پر ختم ہوگئی اور حضور پاکﷺ کلی امور کے علوم سے نوازے گئے۔ حضور اکرمﷺ نے ارشاد فرمایا:

اُوْتِيْتُ عِلْمُ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ

''مجھے اوّلین اور آخرین کا علم عطا کیا گیا''

ارشادِ ربانی ہے:

وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴿الانعام: 59﴾

''زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ نہیں اور نہ کوئی ایسی خشک وتر چیز ہے جسکا بیان کتاب مبین میں نہ ہو''

چنانچہ آج سے پانچ سو یا ہزار سال پہلے والے مفسرین نے اپنے زمانے کی معلومات کے مطابق تفسیریں لکھیں جو کہ ان کی نیک نیتی پر منحصر تھیں کیونکہ جب تک کسی چیز کا وجود دنیا میں موجود نہ ہو اس کے متعلق ذہن میں اس کا علم یا تصوّر نہیں آ سکتا اور اس کا سمجھنا محال ہے مگر جب وہ چیز سامنے آ جائے تو اس کا ذکر قرآن مجید میں بخوبی سمجھ آ سکتا ہے اور بتدریج اس کے مطابق قرآن حکیم میں تعلیم و ہدایت پا سکتے ہیں۔ جیسے آج سے قبل کے زمانے والے اپنے حالات کے مطابق پاتے رہے ہیں۔

فرمایا: یہ حقیقتِ ثابتہ ہے کہ جس وجود، جس ہستی کے ذریعہ قرآن حکیم دنیا میں لایا گیا وہ مکمل اور اکمل تھی اور اس کے بعد نہ کسی علم کی ضرورت ہے اور نہ ہی دوسری کتاب لانے والے کی ضرورت ہے۔ چونکہ حضور پاک ﷺ آخری پیغمبر اور خاتم النبین ہیں۔ انکا لایا ہوا قرآن حکیم دنیا کے اختتام تک اور قیام قیامت تک کیلئے مکمل ہدایت ہے اسی لئے فرمایا گیا۔

اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَرَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًاؕ ﴿المائدہ :3﴾

''آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا''

فرمایا: حدیث پاک ہے۔

لَا یَشۡبَعُ مِنۡهُ الۡعُلَمَاءُ وَلَا یَخۡلُقُ عَنۡ کَثۡرَةَ تَلَاوَتِهٖ وَلَا تَنۡقَطِعُ عِجَائِبَهٗ

یعنی قرآن مجید وہ کتاب ہے جس سے علماء کبھی سیری محسوس نہیں کریں گے اور نہ ہی کثرت اور تکرار تلاوت سے اس کے لطف میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات ختم ہوں گے۔ یعنی نئے نئے علوم و معارف کا خزانہ کبھی ختم نہ ہو گا اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

تحصیلِ علم

فرمایا: ضرورت ہے کہ تعلیم حاصل کر کے اس پر عمل بھی کیا جائے اور اپنا مطمحِ نظر درست کیا جائے۔ راستہ پر چلنا ہی مقصود نہیں ہوتا بلکہ کسی جگہ پر پہنچنا مقصود ہوتا ہے اور علمِ الٰہی کے حصول کے لئے تو طالب علم اللہ تعالیٰ کا مہمان ہوتا ہے۔ حضرت ابوداؤد کی حدیث ہے کہ نورانی فرشتے ایسے طالب علم کے قدموں کے نیچے اپنے پَر بچھاتے

ہیں جو علم کی خاطر سفر اختیار کرتا ہے۔ نیز فرمایا: جس نے علم کا رستہ اختیار کیا اس نے جنت کا رستہ اختیار کیا اور جس نے طلبِ علم میں وفات پائی وہ شہید مرا۔ اور حکم دیا کہ گود سے لیکر گور تک علم سیکھو۔ **اطلبوا لعلم من لمهد الى اللحد**

فرمایا: میں نے بہت سفر کئے ہیں اور انسانوں کو کتاب کی طرح پڑھا ہے۔ اس میں مسلمان بزرگ اور غیر مسلم بزرگ ادنیٰ واعلیٰ ہر قسم کے انسان شامل تھے۔ میں نے کیمیائی نظر سے دیکھا ہے۔ یہ حصولِ تعلیم کا بہت اچھا ذریعہ ہے۔

فرمایا: حضور سرور کائناتﷺ نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے علاوہ کسی اور مقام پر جانے کا حکم نہیں دیا۔ لیکن طلبِ علم کے لئے فرمایا: **اُطْلُبُو الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ** یعنی طلب علم کے لئے اگر چین جیسی دور دراز اور دشوار گزار جگہ پر بھی جانا پڑے تو جانا چاہیے۔ ایسا علم محض کتابی علم ہی نہیں بلکہ کوئی اَور علم بھی ہے جو صرف سینہ بہ سینہ ہی حاصل ہوسکتا ہے بلکہ عملی تعلیم ہے جو زندہ ہستی سے صرف ذاتی تعلق سے ہی مل سکتی ہے۔ جس کے متعلق حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا **دَرَسْتُ الْعِلْمَ حَتّٰى صِرْتُ قُطُباً**. یہ وہ علم ہے جو محض کتابوں سے نہیں ملتا۔ یہ وہ علم ہے جو انسان کو خدا سے بھی ملا دے۔

فرمایا: کیا آپ کا خیال ہے کہ ایک شخص جو گزشتہ چالیس پچاس سال سے باقاعدہ تحصیل علم میں لگا رہا اور عبادت میں بھی مشغول رہا۔ وہ بہت بڑا عالم اور ولی اللہ ہوگیا؟ ممکن ہے کہ وہی شخص ولایت کے مقام سے حقیقتاً بہت دور پہنچ گیا ہو کیونکہ ہوسکتا ہے کہ جب اس نے علم اور عبادت شروع کی تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگیا ہو کہ وہ بہت بڑا عالم اور عابد ہے اور اس کے مراتب بڑھ رہے ہیں اور اس نے نیکیوں کے انبار اکٹھے کر لئے ہیں۔ اس طرح اس کے دل میں عُجب کا ایک درخت اُگ آیا ہو اور اس کے علم اور عبادت کے ساتھ ساتھ وہ شجر عُجب بھی بڑھتا رہا ہو اور وہ اب ایک تناور درخت بن چکا ہو۔ یہ چیز مقامِ ولایت کے منافی ہے۔ اپنے علم اور عبادت کی کثرت پر غرور، تباہی کا باعث ہے کیونکہ زیادہ علم اور عبادت کے باوجود ابلیس کا کیا حال ہوا۔ راندۂ درگاہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی عاجزی پسند ہے۔ قرآنی حکم ہے۔

فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ط هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿النجم:32﴾

''تم اپنے آپ کو پاک صاف نہ جتاؤ جو پرہیز گار ہے وہ اس سے خوف واقف ہے''

اصل عبادت وہی ہے جو محض اللہ تعالیٰ کی محبت، عشق، اخلاص اور اس کی ملاقات کے فرطِ شوق میں کی جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴿الانعام:163﴾

''کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت میرا جینا اور میرا مرنا سب خدائے رب العلمین ہی کے لئے ہے''

فرمایا: عمل کیا چیز ہے؟ یہ تو ایک اضطراری چیز ہے جو علم کا نتیجہ ہے جیسا علم ہوگا ویسا ہی عمل ظہور میں آئے گا۔ اس لئے علم صحیح کا سیکھنا نہایت ضروری ہے۔ خیالات صحیح ہوں اور علمِ یقینی حاصل کیا جائے تو بات بنتی ہے۔

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ علم بلا عمل ایک آزار اور عمل بغیر اخلاص بے کار ہے۔

فرمایا: علم کی قدر و منزلت کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ انبیاء و رسل نے اللہ تعالیٰ سے ضرورۃً اولاد وغیرہ طلب کی لیکن حضور پاک ﷺ کو ارشاد ہوا۔

قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ﴿طٰہٰ:114﴾

''آپ دعا کروائے میرے پروردگار مجھے علم زیادہ سے زیادہ عطا فرما''

اللہ تعالیٰ جس کو علم و حکمت عطا فرماتا ہے خیر کثیر عنایت فرماتا ہے۔

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ط ﴿البقرۃ: 269﴾

''اور جس کو حکمت ملی بے شک اس کو بڑی نعمت ملی''

فرمایا: علمِ یقینی کی مثال ایسی ہے جیسے سورج چمک رہا ہو اور کسی سے کہا جائے کہ اس وقت رات ہے تو وہ کبھی نہیں مانے گا اگرچہ وہ کتنا ہی فدائی ہو کیونکہ یہ خلافِ علم و یقین ہے۔ اس لئے ہر بات کا علم یقینی اور صحیح ہونا چاہیے تاکہ تمام اعمال جو اس کے نتیجہ میں رونما ہوں وہ بھی صحیح ہوں۔ ایسا علم ایک نور ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

فرمایا: علم سیکھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے وہی علم سیکھا جائے جو علمِ نافع ہو۔ علمِ نافع کا حصول فرض قرار دیا گیا ہے۔ یہ ان اصحابِ علم کی صحبت و رہنمائی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ جنہوں نے یہ خود ایسے اصحاب سے حاصل کیا ہو جو نسبت رسول ﷺ کی زنجیر میں منسلک ہو چکے ہوں۔ یہی وہ اولوالالباب ہیں جن کی رہنمائی سے ہم علم صحیح (نافع) حاصل کر سکتے ہیں۔

مخلوق خدا کی خدمت

فرمایا: اللہ کی مخلوق کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا چاہیے۔ **تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ** کا نمونہ بننا چاہیے۔ مخلوقِ خدا اللہ پاک کی اپنی چیز ہے۔ اللہ پاک ان سے شفقت کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿البقرة:143﴾

''اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا مہربان اور صاحبِ رحمت ہے''

اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ (مخلوقِ خدا اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے) اصل چیز اس کی مخلوق کی خدمت ہے۔ نیت یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو۔ خدمتِ خلق اعلیٰ عبادت ہے اور اللہ پاک کی خوشنودی کا اعلیٰ ذریعہ ہے۔ خدمتِ خلق اور خلقت سے شفقت کرنا اس خیال سے کہ یہ اللہ کی مخلوق ہے اعلیٰ عبادت ہے اور اپنی روحانی ترقی اور دوامِ نسبت کا ذریعہ ہے۔ سعدیؒ:

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

فرمایا: حضور پاکﷺ کا فرمان ہے کہ

1۔ ایمان کے بعد افضل ترین نیکی مخلوقِ خدا کو آرام دینا ہے۔

2۔ تمام مخلوق خدا کا کنبہ ہے پس خدا کا محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کی خدمت کرتا ہے۔

3۔ جس نے اپنے بھائی کی کوئی ضرورت پوری کی خدا قیامت میں اس کی ضرورت پوری کرے گا۔

ایک بزرگ (حضرت داؤد بن نصر طائیؒ) کا قول ہے کہ توبہ وعبادت سے بندوں کو وہ فائدہ نہیں پہنچتا جو بندے کو بندوں کی خدمت وحاجت روائی سے پہنچتا ہے۔

فرمایا: مخلوقِ خدا کی خدمت اگر اپنی ذاتی سربلندی کے لئے کی جائے تو وہ کفر ہے جو خدمت محض اللہ پاک کی رضا اور خوشنودی کے لئے کی جائے وہی اصلی خدمت ہے۔ ہمہ وقت اپنا دل اللہ پاک کی طرف متوجہ رکھنا چاہیے۔ دنیا کے تمام کاروبار کرتے ہوئے بھی اللہ کی یاد دل میں تروتازہ رکھنی چاہیے۔ اگر ایسا ہو جائے تو تمام زندگی عبادت ہو جاتی ہے اور ایسا شخص باخدا ہو جاتا ہے۔ اسے خدمتِ خلق کا اجر دوہرا ملتا ہے۔

فرمایا: مخلوقِ خدا کے ساتھ شفقت اور نرمی سے بات کرنی چاہیے۔

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴿البقرة: 83﴾ ''لوگوں سے اچھی باتیں اچھے طریقے سے کہو''

حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ فرعون سے:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿طه:44﴾

''اور اس سے نرمی سے بات کرنا شاید وہ غور کرے یا ڈر جائے''

قرآن پاک میں حکم ہے کہ محبت اور نرمی سے گفتار کرو۔ خصوصاً جب لوگوں کو نصیحت اور اللہ پاک کی طرف ترغیب دینی ہو۔ اللہ پاک کے دوست کے لئے نہ یہ خوشی کا باعث ہوتی ہے اور نہ رنج کا باعث کیونکہ اس کی منزل اور مقام تو ذات پاک باری تعالیٰ ہوتی ہے اور ہر چیز اسی کی طرف سے آ رہی ہے۔

ہر چہ از دوست بآید نیکو است

فرمایا: ایک مرتبہ ایک بدو نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے ایسے عمل کا حکم دیجئے جو مجھے جنت میں لے جائے۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انسان کو غلامی سے آزاد کر، انسان کی گردن کو قرض سے چھڑا، اگر تیرا رشتہ دار بھی ظلم کر رہا ہے تو اس کا ہاتھ پکڑ لے، اگر تیرے اندر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو بھوکے کو کھانا کھلا، پیاسے کو پانی پلا، نیکی کا حکم کر اور برائی سے لوگوں کو روک اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم اتنی احتیاط کر کہ کسی کے حق میں بری بات اپنی زبان سے نہ نکال۔ یہ وہ اعمال ہیں جو تجھے جنت میں لے جائیں گے۔

مومن ِ کامل کی زندگی خدمتِ خلق کے لئے وقف ہوتی ہے۔ قیامت کے بازار میں دلوں کو راحت پہنچانے سے زیادہ کسی اور چیز کی قدر نہ ہوگی۔

فرمایا: خدمتِ خلق بہترین عبادت ہے خدمتِ خلق کا اعلیٰ مقام مخلوق کو خالق سے ملانا ہے۔ تمام وظائف، اذکار، اشغال، مراقبہ وغیرہ سے افضل عبادت قرب ذات اور مدارج اعلیٰ کے حصول کا ذریعہ یہی خدمت ہے۔ اس خدمت کے ادا کرنے میں نفس اور شیطان کے دھوکہ سے بچنا ضروری ہے۔ اس خیال کا پیدا ہونا کہ محض تخلیہ ہی پاکیزگی نفس کے لئے ضروری ہے ایک باطل خیال ہے یا یہ کہ مخلوق کے ہجوم سے معمول میں فرق پڑ جاتا ہے۔ یہ سب حقیقت سے دور لے جاتے ہیں۔

خلفائے دربار کا فرض

فرمایا: خلافت ایک امانت ہے اور اس کی حفاظت کرنی فرض ہے۔ درویش کا وقار بہت قیمتی ہے اسے ٹھیس نہیں لگنی چاہیے۔ اگر کوئی شخص محض اس لئے مخالفت کرتا ہے کہ وہ درویش کیوں ہے تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ جس طرح ایک فرد کا وقار ہے اسی طرح اپنی جماعت کا وقار بھی ہے۔ تمام خلفا کا فرض ہے کہ وہ اس جماعتی وقار کی حفاظت کریں۔

اپنی جماعت کے ہر فرد کی مدد کرنی چاہیے اور اس فرد کی بھی جس سے جماعت کو فائدہ ہو سکتا ہے تاکہ وہ باوقار زندگی بسر کر سکے۔ باہمی محبت و پیار محض خدا کی رضا کے واسطے رکھنا چاہیے اور ایک دوسرے کی خدمت کرنی چاہیے۔

مسائلِ دین خود اچھی طرح سمجھ کر اپنے ساتھیوں کو سمجھانے چاہئیں اور ان کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہیے۔ بالخصوص عام لوگ فرائض، حقوق العباد اور آدابِ طریقت سے ناواقف ہوتے ہیں۔ خلفا کو ان کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ ان مقاصد کے لئے **''اورادشریف نظیریہ''** کی مجالس کا انتظام کرنا بہتر ہے۔

فرمایا: رسول خدا ﷺ سے ہمیں تین امور پہنچے ہیں: -

1۔ ہمارا مقصود بالذات اللہ تعالیٰ ہو دنیا کی کل کائنات جو جمادات، نباتات اور حیوانات پر مشتمل ہے انسانی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ہے تاکہ ہم ان سے کام لے کر مقصود بالذات تک پہنچنے کے لئے قدم اٹھائیں اور کوشش کریں۔

2۔ حکمِ الٰہی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴿الذریت : 56﴾

''اور میں نے جن وانس کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں''

ہم پر لازم ہے کہ ہم اس حکم کے مصداق بنیں ہم اللہ کے بندے بن جائیں ایسا نہ ہو کہ ہم محض مادی وسائل کے بلاتمیز حلال وحرام کے حصول میں اس قدر منہمک ہو جائیں کہ اصل مقصود سے دور جا پڑیں۔ سعدیؒ کا شعر ہے۔

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است
تو معتقد کہ زیستن بہرِ خوردن است

''کھانا زندہ رہنے اور ذکر کرنے کے لئے ہے اور تُو اس بات کا معتقد ہے کہ
زندگی بس کھانے کے لئے ہے''

3۔ اللہ تعالیٰ نے جملہ انبیاء علیھم السلام کو اس لئے مبعوث فرمایا کہ وہ انسانوں کو اپنے اللہ سے ملنے کی تعلیم دیں اور رہنمائی کریں۔ چنانچہ یہ اپنے اپنے زمانے میں یہی تعلیم دیتے رہے اور آخر میں پوری دنیا کے لوگوں کو اپنی طرف بلانے کے لئے اپنے محبوب حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴿السباء: 28﴾

''اور ہم نے آپ ﷺ کو تمام انسانوں کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تاکہ ایمان لانے پر انکو ہماری رضا وثواب کی خوشخبری سناؤ اور ایمان نہ لانے پر ان کو ہمارے غضب اور عذاب سے ڈراؤ''

فرمایا: ہر صاحبِ طریقت کا فرضِ اوّلین یہ ہے کہ وہ اپنے تزکیہ نفس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اسی ذات کی طرف جو مقصود بالذات ہے دعوت دے اور ملائے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط ﴿النحل:125﴾

''اپنے رب کی طرف بلاؤ حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان سے اس طریقے پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہو''

یعنی حکمت، تدبیر اور اچھی نصیحت سے اور نرم کلام اور شیریں زبان سے تلقین کرو اور یہ تلقین بصورتِ تکرار ہو اور یہ تلقین خالص رضائے الٰہی کے مقصد سے ہو اور اپنے ذاتی آرام اور مادی فوائد کو مدّنظر رکھنا غیر مناسب ہے بس صرف مقصود بالذات تک پہنچنے اور مخلوق کو مالک سے ملانے کا ہی خیال رہے اسی میں صاحبِ طریقت کی ترقی اور عروج کا راز مضمر ہے۔

اولیاءاللہ تبلیغ دین کے لئے حکیمانہ طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل دو مثالوں سے ظاہر ہے۔

فرمایا: جب سرحلقہ چشتیاں خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کو حکم ہوا کہ جا کر اجمیر (ہندوستان) کے علاقہ میں مخلوقِ خدا کو اللہ کی طرف دعوت دو۔ تو حضرتؒ وہاں تشریف لے گئے اور مرشد کے حکم کے مطابق مخلوق کو مالک کی طرف بلانے کے لئے اجمیر میں قیام فرمایا۔ لیکن کئی روز تک کوئی بشر ان کی طرف راغب نہ ہوا۔ سوچا کہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ چونکہ وہ ہندو لوگ موسیقی اور سماع کے بڑے دلدادہ تھے اور ان کے یہی مشاغل تھے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے بھی سماع کی مجلس قائم کی اور لوگ آہستہ آہستہ ان کی طرف راغب ہونے لگے اور بڑا مجمع ہونے لگا۔ چونکہ لوگوں کے طبائع مختلف ہوتے ہیں بعض کی طبیعت اچھی اور بعض کی بُری۔ پس انہوں نے مجمع کی طرف باطنی توجہ دینی شروع کی۔ اچھے لوگ ان کی طرف جلد مائل ہوئے۔ ان کو تعلیم دینی شروع کی۔ آہستہ آہستہ یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ اُس نے تمام ہندوستان بلکہ اور ملحقہ ممالک کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا۔

فرمایا: اسی طرح جب خواجہ عزیزان علی رامیتنی نقشبندیؒ کو خوارزم جانے کا حکم ہوا تو وہاں تشریف لے گئے۔ حاکمِ شہر سے تحریری اجازت لے کر شہر میں ایک جگہ قیام کیا اور گوشہ نشین ہوئے۔ چونکہ ان کو امر بالمعروف کا حکم ہوا تھا اور کوئی شخص بھی ان کے پاس نہ آتا تھا آپ سوچ میں پڑ گئے۔ ایک روز مخلوق کا ہجوم دیکھا لوگ دوڑے جا رہے تھے۔ پوچھا کہ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ کسی نے بتایا کہ یہ مزدور لوگ ہیں مزدوری کے لئے کام حاصل کرنے کی خاطر

دوڑ رہے ہیں۔ حضرتؒ نے بھی سوچا کہ مخلوق کو متوجہ کرنے کے لئے مزدوری ہی ایک اچھا ذریعہ ہے۔ چنانچہ آپؒ نے لوگوں کو مزدوری کی دعوت دی اور چند مزدوروں کو ساتھ لے کر واپس آئے اور ان سے کہا کہ میرا کام یہ ہے کہ باوضو ہو کر آج کا دن میرے ساتھ ذکرِ الٰہی میں گزارو۔ شام کو مزدوری کے علاوہ آپ نے کھانا بھی انہیں کھلایا اور دوسرے دن پھر آنے کو کہا۔ چونکہ مزدوری ان کو سستی پڑتی تھی اور کھانا بھی مفت مل جاتا تھا جسمانی کام بھی کوئی نہ تھا۔ سارا دن آرام و سکون تھا۔ اس لئے چند دنوں کے بعد زیادہ تعداد میں لوگ آنے شروع ہو گئے۔ خواجہ صاحبؒ کی صحبت اور باطنی توجہ سے ان پر اتنا اثر پڑا کہ وہ پھر ایک ساعت کے لئے بھی جدائی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت خواجہؒ نے چند روز کے بعد فرمایا کہ میرے پاس رقم ختم ہو گئی ہے اس لئے میں اب مزدوری کی رقم ادا نہیں کر سکتا۔ لیکن مزدوروں نے بغیر مزدوری کے حسبِ دستور آمد و رفت جاری رکھی۔ بہت جلد حلقۂ ارادت اتنا وسیع ہو گیا کہ اس علاقہ اور گرد و نواح کے لوگ بھی جوق در جوق حضورؒ کی جماعت میں شامل ہونے لگے اور فیض یاب ہونے لگے۔

فرمایا: زیادہ تر غربا پر توجہ دی جائے۔ رسول خدا ﷺ نے بھی غربا ہی سے اشاعت اسلام کا آغاز فرمایا۔ جب حضور پاک ﷺ معراج پر تشریف لے گئے اور سب کچھ آپ ﷺ کو دکھایا گیا اور آخر میں کہا گیا کہ ایک جگہ اَور ہے۔ چنانچہ وہ جگہ بھی آپ ﷺ کو بتائی گئی تو دیکھا کہ مساکین کا مجمع تھا۔ ان کو دیکھنے سے آپ ﷺ پر اتنا اثر ہوا کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے التجاء کی:

اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَّحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَۃِ الْمَسَاکِیْنِ

''اے اللہ مجھے مسکینوں جیسے زندہ رکھ اور مسکین موت عطا کر اور میرا حشر بھی مساکین کے طبقہ میں کر''

اس لئے خلفا صاحبان کو چاہیے کہ وہ غربا کی طرف زیادہ توجہ دیں امیر لوگ خود بخود غریبوں کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر مقصود بالذات کی طرف کھچے چلے آئیں گے۔ یہ خیال ضرور رہے کہ اس میں ذاتی اور نفسانی تقاضوں کا دخل بالکل نہ ہو بلکہ مقصود بالذات کی طرف ہر لحہ توجہ رہے۔ خود بھی ذات باری تعالیٰ سے ملنے کی کوشش میں لگا رہے اور دوسروں کو بھی اسی ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ سے ملانے کی کوشش کرے۔

نیز فرمایا کہ صوفی کے لئے چار چیزیں لازمی ہیں۔

1۔ تواضع اور انکساری اختیار کرے۔

2۔ ہر مشکل کو صبر سے برداشت کرے اور کسی تنگی و تکلیف سے نہ گھبرائے بلکہ ہر حال میں صابر و شاکر رہے۔

3۔ اسمِ ذات کی کثرت اور مداومت رکھے۔

4۔ اپنے شیخ کی مرضی کے مطابق چلے۔ خواہ اس کا اپنا خیال بظاہر درست ہی کیوں نہ معلوم ہوتا ہو۔

غلط تصوف کا رواج

فرمایا: سلوک سے مقصود ذکرِ خدا اور نفی ما سویٰ اللہ پر قائم رہنا اور اپنے اندر نسبت رسولی ﷺ پیدا کرنا ہے۔ بعض لوگ صوفیوں کا لباس پہن کر اپنے لئے دنیاوی مفاد جمع کرنے کی خاطر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور یہ تعلیم دیتے ہیں کہ اصل مقصود لطیفہ کا حاصل کرنا اور مراقبوں کی کثرت کرنا ہے حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔

شق اول

یہ لوگ زیادہ تر تعلیم اس امر کی دیتے ہیں کہ لطیفہ حاصل ہو جائے اور اللہ والے بن جائیں یا فلاں وظیفہ یا فلاں عمل کیا جائے تو عامل بن جائیں گے اور دنیاوی مقاصد حاصل ہو جائیں گے۔ چونکہ انکا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا نہیں ہوتا اس لئے وہ محروم رہتے ہیں۔ ذکرِ الٰہی سے بذریعہ کشف لطیفہ کے جو حالات معلوم ہوتے ہیں وہ بالطبع ہوتے ہیں۔ دیکھنا چاہیے کہ نماز کے پڑھنے سے مقصود رکوع، سجود اور قیام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت مقصود ہے اور پھر اس کے ذریعے سے نسبت رسولی ﷺ کا قیام ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ط اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ط وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ط ﴿العنکبوت: 45﴾

''اور نماز قائم کرو، بیشک نماز بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے اور البتہ ذکرِ الٰہی سب سے بڑھ کر ہے''

اس آیت مبارکہ میں امر **اقامت صلوة** کا ہے اور اس کا نتیجہ **نهی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ** ہے جبکہ خدا کے لاکھوں بندے نمازیں پڑھتے ہیں مگر پھر بھی فحشاء اور منکر کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ لوگ نہ تو نماز اور نہ ہی ذکرِ الٰہی صحیح طریقے سے ادا کرتے ہیں اور نہ ہی ان کو مقصودِ اصلی کا خیال ہوتا ہے۔ وہ محض رسمی طور پر ایسا کرتے ہیں۔

شق ثانی

کثرتِ مراقبہ سے ایسے صوفی لوگ اپنے مرید کو ایک خاص نقطہ نگاہ کے تصور پر لاتے ہیں اور وہ مرید اسی تصور کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے حالانکہ اس کا یہ تصور غلط ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ **لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ﴿الشوریٰ﴾** ہے۔ ''اس جیسی کوئی چیز نہیں''

جسم اسکا نہیں اور نہ ہی کسی کیف میں آ سکتا ہے۔ وہ تو انسانی وہم وخیال سے وراء الوریٰ ہے لہٰذا وہ تصّور یا تصویر جو وہم وخیال میں آئے نعوذ باللہ خدا نہیں۔ بلکہ اگر ایسا خیال کرے تو مشرک ہو جاتا ہے۔ جب اسلام کے اندر ہی نہ رہا تو وہ کرتا کیا ہے اور حاصل کیا کرتا ہے؟

سادہ لوح لوگ اکثر بناوٹی صوفیوں کی ظاہری شکل وصورت، عبادت اور عادت کو دیکھ کر ان کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور مرید ہو کر سالہا سال غلط طریقے پر چلتے رہتے ہیں۔ ایسے طریقے سے اور ایسے وظیفوں سے نفسانیت مغلوب نہیں ہوتی بلکہ اُلٹا نفسانیت غالب ہوتی ہے اور وہ رضائے الٰہی سے محروم رہتے ہیں اور اپنی زندگی خراب کر لیتے ہیں۔

جاہل صوفیا اور علمائے سوٗ

فرمایا: اس زمانے میں جو سُستی اور غفلت امور شرعی میں واقع ہوئی ہے اور جو فتور نقصانِ مذہب اور دین کے رواج دینے میں ظاہر ہوا ہے سب کچھ ان بُرے صوفیوں اور علمائے سوٗ کی نیت کے بگڑ جانے کا باعث ہے۔ یہ لوگ اپنے علوم کو غلط طریقے پر خرچ کرتے ہیں یہ ان کے چہروں پر ایک بدنما داغ ہے بلکہ یہ لوگ اپنی جان کے خود دشمن ہیں۔ حضور پاکﷺ نے ایسے ہی لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اِتَّخَذُوۡا جُهَّالًا فَافۡتَوۡا بِغَیۡرِ عِلۡمٍ فَضَلُّوۡا وَاَضَلُّوۡ

’’انہوں نے جاہلوں کو رہنما بنا لیا جو بغیر علم فتوے دیتے ہیں۔ وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا‘‘

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں۔

مَثَلُ الَّذِیۡنَ حُمِّلُوا التَّوۡرٰةَ ثُمَّ لَمۡ یَحۡمِلُوۡهَا كَمَثَلِ الۡحِمَارِ یَحۡمِلُ اَسۡفَارًاط ﴿الجمعته:5﴾

’’جن لوگوں کے (سر) پر تورات لا دی گئی پھر انہوں نے اس (کے بارِ تعمیل) کو نہ اٹھایا ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں‘‘

ایسے ہی علماء کے بارے میں یہ فرمان نازل ہوا ہے۔

فرمایا: کسی اچھے آدمی نے شیطان کو دیکھا کہ بیکار بیٹھا ہوا ہے۔ بیکاری کا سبب پوچھا گیا۔ شیطان لعین نے جواب دیا کہ میری طرف سے علماءسوء اور جاہل صوفیاء دنیا میں موجود ہیں جو میرے وکیل ہو گئے ہیں اس لئے مجھے اس وقت فراغت ہے۔

فرمایا: دنیا میں سب سے بہتر جگہ ماسوائے مسجد الحرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے مسلمانوں کی عام مساجد ہیں جن میں نماز پڑھی جاتی ہے۔ پھر مسجد میں منبر ایسا متبرک مقام ہے جو نشست گاہ حضورﷺ کا مظہر ہے جس پر کھڑے ہوکر یا تشریف فرما کر آپﷺ خطبہ فرمایا کرتے تھے۔ اب اگر کسی تنخواہ دار مولوی یا خطیب کو اس کی مزدوری نہ ملے تو وہ کبھی بھی اس منبر پر کھڑا ہوکر خطبہ دینے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ بلکہ اگر اُس کا بس چلے تو اُسی مسجد کو مسجد ضرار کا حکم لگا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور جن لوگوں نے اس کی اعانت نہ کی ہو ان پر کفر اور فسق کے فتوے جڑ دے۔ دراصل اس کی تعلیم محض مالی فائدے کی غرض سے ہوتی ہے۔ جب ایسی حالت ہو تو ایسے خطیب صاحبان اور دیگر عام مزدوروں میں کیا فرق و امتیاز رہا کیونکہ ان کی تعلیم کا مدعا ہی حصولِ روزگار اور پیٹ پروری ٹھہرا اور وہ احکامِ الٰہی واحکامِ رسولﷺ اَوروں کو تو بتاتے ہیں مگر خود ان پر عمل نہیں کرتے یہ علمائے سوء کا حال ہے۔ فرمان خداوندی ہے:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ط ﴿البقرة: 44﴾

''کیا تم لوگوں کو نیکی اور بھلائی کا حکم کرتے ہو اور اپنی جانوں کو بھول جاتے ہو۔ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو''

فرمایا: جاہل صوفی اور علماء سوء ایک ہی درجہ میں ہیں اور ان کا فساد متعدی ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص دھوکے سے کارخانۂ اسلام میں فتور ڈالے اور مسلمانوں کو گمراہ کرے وہ سخت سزا کا مستحق ہے نہ کہ انعامِ الٰہی کا۔

پس یقینی طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ ایک عالمِ سوء اور جاہل صوفی کی صحبت زیاں ہی زیاں ہے اور اس سے احتراز واجتناب لازمی ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں:

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نباید داد دست

فرمایا: بعض دفعہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ بعض علماء حق اور بعض مشائخ متقدمین میں سے اور موجودہ زمانے میں بھی دنیا کے کاروبار میں مشغول ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں تو لنگر کے نام سے پیسے اکٹھے کرتے ہیں اور اس طرح وہ بھی دنیادار بنے ہوئے ہیں اور دنیاداروں میں شامل ہیں۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ وہ لوگ (علمائے حق اور صحیح صوفی) بادی النظر میں ایسے نظر آتے ہیں مگر وہ اپنی آرزو اور خواہش نِفس سے نکل چکے ہوتے ہیں اور نسبت رسولیﷺ قائم کر چکے ہوتے ہیں کیونکہ ایسے

بزرگوں کی خدمت میں زائرین کی کثیر تعداد حاضر ہوتی رہتی ہے۔ لہذا یہ بزرگ تمام زائرین کی آسائش اور خدمت کے لئے لنگری نظام قائم کرتے ہیں۔ جس کی خدمت کے لئے عموماً زائرین رضا کارانہ طور پر شامل ہوتے ہیں اور یہ نظام جاری رہتا ہے۔ لہذا یہ نظام دنیاوی کاروبار نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ یہ ذاتی منفعت کے لئے نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں کسی قسم کا چندہ یا معاوضہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ خالص رضا کارانہ تنظیم ہوتی ہے۔ جو زائرین کے باہمی تعاون سے جاری رہتی ہے۔

سعد بن ابی وقاصؓ، انس بن مالکؓ، حضرت عثمانؓ اور امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کو دیکھئے کہ باوجود کامیاب تجارت کرنے کے یادِ الٰہی سے غافل نہیں تھے۔ خواجہ بہاؤالدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے منیٰ کے بازار میں ایک تاجر کو دیکھا کہ اُن ایام میں کم و بیش پچاس ہزار دینار کی تجارت روزانہ کرتا تھا اور اس کا دل مالک کی یاد سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہ تھا یہ وہ علماء اور صوفی ہیں جو کہ وارث الانبیاء ہیں اور ان کے قلم کی سیاہی قیامت کے دن خونِ شہداء کے برابر ہوگی۔

توکّل علی اللہ

فرمایا: توکّل کی حقیقت یہ ہے کہ انسان خدا کا محتاج ہے اور اس کا یہ یقین کہ اس کام کا انجام کو پہنچنا یا ہونا مالک کے ارادہ اور مشیت پر منحصر ہے تو وہ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ خداوند کریم جو **خلّاق عظیم** ہے اس کو وہ کام منظور ہو جاتا ہے تو اس کے اسباب جن پر اس کی تکمیل موقوف ہوتی ہے وہ پیدا ہو جاتے ہیں اور آسان ہو جاتے ہیں۔ مالک کی طرف سے وہ کام اسباب و کوشش کے ساتھ مکمل ہو جاتا ہے اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ انسان کی کوشش اور اسباب توکّل کی منظوری کے آثار ہیں اور اسی طرح بعض کام بند ہونے اور خراب ہونے کے بھی اسباب ہوتے ہیں۔ انسان فائدہ اور کامیابی کو دیکھ کر صرف کوشش اور اسباب پر ہی نگاہ رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ کام کو اپنی کوشش کا نتیجہ سمجھتا ہے یا اپنے افسر یا اپنے دوست یا کسی معاون کی مہربانی سمجھتا ہے تو آخر میں مشیت ایزدی اس کے خلاف ہو جاتی ہے اور اسباب مخالف اور مانعات غالب آ جاتے ہیں۔ سادہ الفاظ میں توکّل اس حالت میں صحیح ہے کہ وہ شخص اپنی کوشش اور اسباب کے خواص کو جوہر ذاتی نہ سمجھے اور یہ یقین رکھے کہ سب کچھ دیا ہوا اللہ ہی کا ہے وہ چاہے تو کوشش کی توفیق نہ دے اور اسباب موافق نہ ہوں اسباب پر توکّل نہ کرنا چاہیے۔ خالقِ اسباب پر توکّل کرنا چاہیے۔

گفت پیمبر با آوازِ بلند
بر توکّل زانوئے اشتر بہ بند

توکّل علی اللہ کے بیان سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ قرآن حکیم کی چند آیات ذیل پر تدبر کرنا چاہیے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿التغابن: 13﴾

''اور اللہ ہی پر ایمان والے بھروسہ کریں''

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ط ﴿الطلاق: 3﴾

''جو اللہ پر توکّل کرتا ہے پس وہی اس کے لئے کافی ہے''

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿المائدہ: 23﴾

''اگر تم ایمان والے ہو تو اللہ ہی پر توکّل کرو''

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿آل عمران: 159﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ توکّل کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے''

توکّل علی اللہ کی حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کسی چیز کی کامیابی کیلئے جو اسباب اللہ نے مقرر کئے ہیں انہیں استعمال کیا جائے لیکن کامیابی کے لئے ان اسباب پر اعتماد نہ کیا جائے۔ بلکہ اعتماد اللہ تعالیٰ کی نصرت وحمایت پر کیا جائے۔ توکّل ترکِ اسباب نہیں بلکہ اسباب پر ترک اعتماد کا نام ہے۔ اعتماد مُسبِّبُ الاسباب پر ہونا چاہیے۔

ہر مقصد کے حصول کے لئے انسان کے لئے مناسب تدبیر اور کوشش کرنا نبی ﷺ کے اقوال واعمال سے ثابت ہے۔ مدینہ منورہ کی حفاظت کیلئے خندق کھودنا، جنگ میں ذرہ پہننا، حفاظت کے لئے قلعہ بندی اور سفر میں زادِ راہ لے کر جانا، یہ سب باتیں سنت رسول ﷺ سے ثابت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سبب کو ان کے اسباب کے ساتھ معلق کیا ہے اور اسی لئے قرآن کریم میں اسباب مہیا کرنے کی تعلیم دی ہے۔ مثلاً فرمایا گیا ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ ﴿الانفال: 60﴾

''اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے لئے تیار رکھو''

اللہ پر بھروسہ اور اعتماد کرنے کا حکم صرف کسی دنیوی مصیبت سے بچنے اور حلال روزی کی تلاش ہی میں نہیں دیا گیا۔ ایک مومن کے لئے سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ وہ شیطان کے فتنوں سے بچے اور زندگی کے تمام معاملات میں اسے ہدایت اور صحیح راہنمائی حاصل ہو۔ قرآن مجید میں صراحت ہے کہ اللہ پر توکّل شیطان کے فتنوں سے بچاتا ہے اور

ہدایت ورہنمائی کے لئے اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِo اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿النحل :99-98﴾

''یعنی جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے پناہ مانگ لیا کرو کہ جو مومن ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں ان پر اس کا کچھ زور نہیں چلتا''

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کتابِ ہدایت ہے اس سے ہدایت اور صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے اور شیطان کے فتنوں سے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر توکّل ہو تو اس کے فتنوں سے بچا جا سکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہدایت اور رہنمائی کے لئے صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات پر بھروسہ کرنا چاہیے کسی اور سے ہدایت نہیں مل سکتی۔

فرمایا: صرف ایک ہی دروازہ کی طمع رکھنی چاہیے اور وہ خدا کا دروازہ ہے اس پر مکمل توکّل ہونا چاہیے۔ اسی ضمن میں اپنا ایک واقعہ بیان فرمایا:

مجھے ایبٹ آباد سے ایک جگہ ضروری جانا تھا اور میرا یہ سفر بوجہ کثیر مخالفت کے پوشیدہ رکھنا مقصود تھا مگر مخالف پارٹی کے لوگ بہت ہوشیار تھے اور انہیں اس بات کا علم ہو گیا اور ہمیں بھی اس بات کا پتہ چل گیا کہ راستے میں تین صد (300) آدمی رائفلوں سے مسلح میری تاک میں بیٹھے ہیں۔ مشورہ کیا۔ چند اصحاب نے مشورہ دیا کہ موٹر میں برقع پہن کر بیٹھا جائے تا کہ دشمن مستورات سمجھ کر حملہ نہ کریں۔ دوسروں نے اس رائے کی تردید کی کہ تلاشی ہو سکتی ہے۔ آخر میں ایک بیرسٹر صاحب نے مشورہ دیا کہ پشاور سے نہایت اعلیٰ کار جس کا ڈرائیور ہندو ہو جو بے لاگ ہو اس کو بلایا جائے اور اس کار میں سفر کیا جائے۔ یہی بات پسند کی گئی۔ موٹر آ گئی اور یہ طے ہوا کہ موٹر میں ایک طرف بستر دوسری طرف ایک ٹرنک اور ان کے اوپر انگریزی ہیٹ رکھے جائیں اور ان کے درمیان میں میں کمبل اوڑھ کر بیٹھ جاؤں۔ یہ طریقہ محفوظ ہے۔ چنانچہ اسی طرح سفر شروع ہوا۔ راستے میں جہاں وہ رائفلوں والے بیٹھے تھے وہاں توت اور شیشم کا جنگل تھا اور سڑک کے دونوں طرف سے اونچی جگہ تھی اور درمیان میں سے سڑک گزرتی تھی۔ میں نے ان تمام رائفل والوں کو تیار بیٹھے دیکھا۔ اب جونہی ہماری موٹر عین درمیان میں پہنچی دفعتاً کوئی چیز ٹوٹی اور موٹر ٹھہر گئی۔ ڈرائیور موٹر سے اترا اس کے نیچے لیٹ کر کچھ کرنے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک اس نے یہ سلسلہ کھٹ کھٹ کا جاری رکھا۔ مجھے موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ مجھے اُس وقت احساس ہوا کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ میں نے خدا پر بھروسہ کرنے کی

بجائے اپنے بچاؤ کی یہ صورت اختیار کی۔ میں نے خدا سے توبہ کی اور اپنی غلطی پر سخت پشیمان ہوا۔ میں نے اللہ سے معافی مانگی اور دعا کی کہ وہ مجھے ایسی موت سے بچائے۔ میری دعا قبول ہوئی اور مجھے مکمل اطمینان ہو گیا۔ اسی وقت ڈرائیور نے کہا کہ موٹر کی کمانی ٹوٹ چکی ہے اور اب یہ موٹر یہاں بغیر نئی کمانی ڈالے بالکل نہیں چل سکتی اور نئی کمانی پشاور سے لانا پڑے گی۔ میں بے اختیار موٹر سے نکلا اور چند قدم ایک طرف کو گیا۔ رائفلوں والے دوڑ کر میرے گرد جمع ہو گئے اور مجھے گھیرے میں لے لیا۔ مگر میرے دل میں مکمل اطمینان تھا۔ دفعتاً ایک آدمی دوسروں کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھا اور مجھے کہا کہ میرا یہ گھوڑا ہے پانچ ہزار روپیہ کا ہے بہت اچھا ہے۔ آپ فوراً اس پر سوار ہو جائیں اور روانہ ہو جائیں۔ میں سوار ہو گیا گھوڑا دوڑنے لگا۔ وہ بہت تیز رفتار گھوڑا تھا اور میں گھڑ سواری میں مہارت رکھتا تھا۔ میرا گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا اور رائفلوں والے آپس میں جھگڑنے لگے کہ جس کے انتظار میں ہم یہاں جمع تھے وہ نکلا جا رہا ہے۔ اسے فوری طور پر شوٹ کیوں نہیں کیا گیا؟ انہوں نے بار بار مجھ پر کئی فائر بھی کئے مگر چونکہ سڑک سیدھی نہ تھی اور ٹیڑھی بل کھاتی ہوئی تھی اس لئے وہ مجھے شوٹ نہ کر سکے اور میرا گھوڑا چالیس میل تک سرپٹ دوڑتا چلا گیا۔ جہاں میرے اپنے آدمی جمع تھے وہاں کسی نے میرا گھوڑا تھاما۔ آج تک مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ گھوڑا دینے والا کون شخص تھا اور وہ کون تھا جس نے اسے آخر میں مجھ سے پکڑا تھا۔ اور سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ وہ گھوڑا کہاں گیا؟ کیونکہ اس کے بعد وہ گھوڑا مجھے کہیں نظر نہیں آیا اور نہ ہی کوئی آدمی مجھ سے ملا۔

اس واقعہ سے مدعا یہ ہے کہ توکّل ہمیشہ خدا کی ذات پر ہی قائم رہنا چاہیے نہ کہ اسباب پر۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کا واقعہ بیان فرمایا کہ ایک روز وہ ایک کنوئیں پر پہنچے اس کا پانی بہت نیچا تھا۔ متردّد ہوئے کہ کوئی رسی نہیں اور نہ ہی پگڑی ہے۔ کیسے پانی نکالا جائے؟ مایوس ہو کر فاصلے پر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ اسی کنوئیں پر جنگل کے جانور چیتا، شیر وغیرہ آئے اور کنوئیں کا پانی اوپر تک آ گیا۔ انہوں نے پانی پیا اور چلے گئے۔ جب حضرت ابراہیم بن ادھمؒ نے یہ واقعہ دیکھا تو اللہ تعالیٰ سے استغفار کی اور دعا کی کہ بارِالٰہا! یہ جانور کوئی گناہ نہیں کرتے۔ تو نے ان پر رحم کھایا ہے اور ان کو پانی سے سیراب کر دیا ہے مگر میں گناہگار ہوں اس لئے میرے لئے ایسا واقعہ پیش آیا۔ مجھے میرے گناہ سے بھی آگاہ کیا جائے اور مجھے پانی بھی عطا کیا جائے۔ جواب آیا کہ ان جانوروں نے مجھ سے طمع رکھی اور تو نے رسی کی طرف رجوع کیا یعنی تو متردد تھا اور اسباب کی طرف نگاہ تھی۔ جب اس کوتاہی سے توبہ کی تو اسی وقت پانی اوپر آیا اور انہوں نے بھی پیا۔

درویش کا مکمل بھروسہ و توکّل مالک الملک پر ہونا چاہیے اور اسی کی طمع رکھنی چاہیے۔ مناسب اسباب ضرور اختیار کرنا چاہیے مگر اسباب پر بھروسہ کافی نہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔

مَنۡ اَحَبَّ اَنۡ یَّکُوۡنَ اَقۡوَی النَّاسِ فَلۡیَتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ

''جو شخص چاہتا ہو کہ سب انسانوں سے قوی تر ہو جائے تو اسے چاہیے کہ اللہ پر توکّل کرے''

توکّل سے انسان نہ صرف یہ کہ اللہ کی مدد کا مستحق ہوتا ہے بلکہ وہ اس کا محبوب بن جاتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُتَوَکِّلِیۡنَ ﴿آل عمران:159﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ توکّل کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے''

ترکِ دنیا اور تارک دنیا

ایک روز ترکِ دنیا اور تارکِ دنیا اصحاب کی حقیقت سمجھانے کے لئے ایک نقشہ بنایا۔

فرمایا: یہ دنیا مثل ایک گھر کے ہے۔ جس کا صرف ایک ہی دروازہ ہے اور اس گھر کے اندر سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات وغیرہ کے ڈھیر بطور خزانہ رکھے ہوئے ہیں۔ بے شمار لوگ اس گھر میں اس دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ جو اپنی محنت اور کوشش سے کوئی نہ کوئی کاروبار کرتے ہیں مثل دوکانداری، ذراعت، ملازمت، تجارت، محنت مزدوری وغیرہ۔ یہ اپنے پیشہ یا کام کی بدولت اس گھر میں داخل ہوتے ہیں اور وہاں سے دولت اٹھا کر لاتے ہیں۔ کوئی کم کوئی زیادہ۔ یہ تمام اہل حرفہ اسی ایک دروازے سے داخل ہو کر مقصود تک پہنچتے ہیں۔

لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی ایسے پیشے سے تعلق نہیں رکھتے مگر اپنے کو بظاہر تارک الدنیا ظاہر کرتے ہیں اور وہ اہل حرفہ اور پیشہ وروں کے سامنے دنیا کی برائیاں بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دین داری اور دنیا داری میں

زمین وآسمان کا فرق ہے اور یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دنیا دار آدمی کبھی بھی دیندار نہیں ہوسکتا اور آخرت میں یہ دوزخ کا ایندھن بنتا ہے۔اور کہتے ہیں کہ ہم نے اسی لئے دنیا کو ترک کردیا ہے۔

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دون
ایں خیال است و محال است و جنون

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ باوجود اپنے دعووں کے اسی گھر کے گرد چکر کاٹتے رہتے ہیں، اسی کے طواف میں مگن ہیں اور بظاہر یہ اعلان کرتے رہتے ہیں کہ آپ لوگوں کا غم ہمیں کھائے جارہا ہے۔اسی غم میں ہماری نیندیں حرام ہورہی ہیں اور آپ کی خیر خواہی اور خدمت کے لئے ہم زندہ ہیں۔مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ لوگ اسی گھر کے اردگرد چکر کاٹتے ہوئے کئی سکیمیں بناتے رہتے ہیں کہ کب اور کیسے موقع ملے کہ وہ اس گھر کے اندر سے یہ زروجواہر اڑا لے جائیں اور ان پر اپنا قبضہ جمالیں یا آنکھ چرا کر ایسے وقت داخل ہوجائیں کہ دوسرا کوئی نہ دیکھتا ہو اور وہ اس دولت پر ہاتھ صاف کرلیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ ان لوگوں میں کوئی لیڈر ہے، کوئی مصلح قوم ہے، کوئی واعظ ہے، کوئی خرقہ پوش پیر ہے، کوئی مولوی ہے اور کوئی فقیر ہے۔ الغرض یہ سب قوم کے رہنما ہیں اور قوم کی کشتی کے ملاح بنے بیٹھے ہیں۔ ظاہر تو یہ کرتے ہیں کہ ہم دنیا سے لاتعلق ہیں۔لیکن حقیقت میں شہد کی مکھی کی طرح اسی متاعِ دنیا پر بھنبھناتے ہیں۔ سعدیؒ فرماتے ہیں:

ترکِ دنیا بمردم آموزند
خویشتن سیم و زر اندوزند

اگر ان لوگوں کی زندگیوں کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے کے بیشتر بگاڑ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے ہیں۔انہیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے اور صراطِ مستقیم اختیار کرنا چاہیے۔

فرمایا: تارک دنیا سے یہ مراد نہیں کہ آدمی حقیر اور عاجز ہوجائے اور نانِ شبینہ کا محتاج ہو اور دربدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرے۔ یہ تصوّر باطل ہے۔ بلکہ تارک الدنیا سے مراد وہ شخص ہے جو باوجود مال ودولت کے اس سے دل نہ لگائے یعنی مال کے آنے پر وہ شیخی نہ بگھارے اور جانے پر غم واندوہ میں مبتلا نہ ہو۔ دولتِ دنیا اس کو کہا جاتا ہے جو دل کے اندر مقام کرلے اور حق تعالیٰ سے غفلت کا سبب بن جائے۔ جیسا کہ مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

چیست دنیا از خدا غافل شدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

لہذا ترکِ دنیا سے مقصود یہ ہے کہ مالِ دنیا سے محبت نہ ہو۔ دنیا کمانے میں اتنا اندھا اور غلطان نہ ہو جائے کہ حلال وحرام کی تمیز اٹھ جائے۔ اگر دل کے اندر اس کا مقام نہیں ہے اور دلی لگاؤ ذات الٰہی کے ساتھ ہے تو یہی مقصود اصلی ہے۔ ایسے انسان کے لئے نسبت رسولی ﷺ حاصل کرنے کے مواقع بکثرت موجود ہوتے ہیں۔ اس کا باطن ذاتِ الٰہی کے ساتھ پیوست اور ملا ہوا زندگی گزار سکتا ہے۔ اگر کسی انسان کی ایسی زندگی ہو تو وہ نہایت خوش قسمت اور کامیاب انسان ہے۔ حکم الٰہی ہے **كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا** کھاؤ، پیو، مگر اسراف نہ کرو۔

مدعا یہ ہے کہ حلال مال کمائے اور اس مال سے کھائے اور کھلائے، پیئے اور پلائے، پہنے اور پہنائے، وقار سے رہے اور دوسروں کی خدمت کرتا رہے اور اپنی زندگی کو فضولیات میں ضائع نہ کرے۔

عصرِ حاضر میں مسلمانوں کی زبوں حالی

فرمایا: ایک روز ایک اعلیٰ آفسر نے امریکیوں کی تعریف کی کہ وہ باوجود اپنے دین سے دوری اور بے راہ روی کے دنیا میں سب سے زیادہ کامیاب ہیں مگر مسلمان دین کے پیروکار ہو کر دنیا میں ذلیل وخوار ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

اعلیٰ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا: قرآن مجید کی تعلیم پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے دین کے تین امور بنیادی اجزا ہیں۔

1۔ عبادات۔ جو توحید کے ماتحت ہیں۔

2۔ معاملات۔ جو عبادت کا جزو ہیں اور انسانی باہمی تعلقات پر منحصر ہیں۔

3۔ تفکر وتدبر۔ اپنی ذات اور سلسلہ کائنات میں غور وفکر اور اس پر عمل پیرا ہونا۔

جب تک ان تمام امور پر صحیح طور سے عمل نہ کیا جائے تو دین کی تکمیل نہیں ہوتی اور قرآن نے ان تینوں امور پر زور دیا ہے۔

دنیا میں مختلف قوموں میں جزوی باتیں پائی جاتی ہیں اور وہ سب اسلام کا جزو ہیں۔ اسلام محض مسلمانوں کے لئے ہی فوائد کا مرکز نہیں بلکہ اس کے جس جزو پر کوئی انسان کسی درجہ میں عمل پیرا ہوگا اسی قدر وہ مستفیض ہوگا۔ قرآن مجید صرف مسلمانوں ہی کے لئے نازل نہیں کیا گیا بلکہ اس کا عمومی خطاب **يَاأَيُّهَا النَّاسُ** یعنی تمام نسل انسانی کے لئے ہے۔ اس لئے قرآنی تعلیم کے ماتحت جو قوم بھی کسی معاملہ میں تگ ودو کرے گی اس کی بحکم الٰہی رہنمائی ہوگی۔ یہ ایسا ہے جیسے ایک مسجد کی تعمیر کرنے میں اگر دو سکھ مستری بھی کام کریں تو یہ نہیں ہوگا کہ انہیں ثواب حاصل ہو مگر ان دونوں مستریوں کو مزدوری تو ضرور مل جائے گی۔

موجودہ زمانے میں روس اور امریکہ والے تفکر و تدبر میں بڑھے ہوئے ہیں۔ جتنی وہ سائنسی ریسرچ پر محنت کر رہے ہیں ہم ان کا پاسنگ بھی نہیں کرتے کیونکہ ان کی ساری سعی و کوشش حکم الٰہی کے ماتحت ہو رہی ہے۔ اسی لئے ان کی رہنمائی بھی ہو رہی ہے اور وہ روز بروز نئی ایجادات میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کے باہمی معاملات بھی مسلمانوں کے مقابلہ میں اچھے ہیں۔ ان میں خیانت، جھوٹ اور دھوکا دہی کم ہے۔ رہا عبادات کا معاملہ تو وہ اپنے خیال کے مطابق ان پر بھی قائم ہیں۔ بخلاف ان کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ قرآنی احکام سے دور ہٹ چکے ہیں۔ ان کے تمام معاملات دگرگوں ہیں۔ اپنی سہل انگاری اور غفلت کے باعث تفکر و تدبر سے منہ موڑ چکے ہیں۔ اپنے دین کو انہوں نے پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ محض رسمی مسلمان رہ گئے ہیں۔ عجیب بے حسی کا شکار ہیں۔ اعتقادات اپنی اصلیت کھو چکے ہیں۔ اخلاقیات کی گراوٹ اور بدعنوانیوں میں یہ روئے عالم میں سب سے زیادہ بدنام ہو رہے ہیں۔ فروعی اختلافات زوروں پر ہیں اور باہمی اتحاد اور یگانگت سے عاری ہیں۔ اسلام میں علم کا حاصل کرنا ہر مرد اور عورت پر فرض قرار دیا گیا ہے مگر مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ اس وقت اقوامِ عالم میں سب سے زیادہ جہالت اسی قوم میں ہے۔

فرمایا: حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ دنیا کی قومیں مسلمانوں پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح بھوکے آدمی کھانے کی لگن پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو بھی بلاتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہﷺ کیا یہ ہماری تعداد کی کمی کی وجہ سے ہوگا؟ فرمایا نہیں۔ تمہاری تعداد اس زمانہ میں بہت زیادہ ہوگی۔ لیکن تمہارے دلوں میں ''وہن'' پیدا ہو جائے گا جس سے تمہاری حالت سیلابی جھاگ کی طرح ہو جائے گی اور تمہارا رعب ختم ہو جائے گا۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہﷺ ''وہن'' سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے وحشت (**حُبُّ الدُّنیَا وَکراھۃ الْمَوْتَ**)۔ ظاہر ہے کہ یہ حضور اکرمﷺ کا امت مسلمہ کے لئے انتباہ ہے کہ جب تمہارے دلوں میں دنیا کی محبت اور موت سے وحشت پیدا ہوگی تو اسلام دشمن قوتیں تمہیں تباہ و برباد کرنے پر تُل جائیں گی۔

جب ہم عصر حاضر میں مسلمانوں کی حالت زار کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اگرچہ ان کی تعداد 130 کروڑ کے قریب ہے اور موجودہ دنیا کی آبادی میں بحیثیت ملتِ واحدہ ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے مگر یہ زمین پر بوجھ بنے ہوئے ہیں اور دیگر اقوام بالخصوص یہود و ہنود، عیسائی اور اشترا کی ان کو ملیا میٹ کرنے کی پوری تیاریاں کر رہے ہیں کیونکہ وہ اسلام کو اوّل درجہ کا دشمن خیال کرتے ہیں۔ یہ حقیقت واضح ہے کہ مسلمان موجودہ زبوں حالی کو اس لئے پہنچے ہیں کہ انہوں نے اسلامی احکام سے منہ موڑ لیا ہے رسولﷺ تعلیم کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ موجودہ ''وہن'' یعنی دنیا سے محبت اور موت سے وحشت کے ذمہ دار یہ خود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بے حسی، دوں ہمتی، بداخلاقی دہشت

گردی، فرقہ پرستی اور جرائم کا شکار ہیں۔ اہم سوال یہ ہے کہ آخر اس زبوں حالی کا علاج ممکن ہے؟

فرمایا: خدائی فرمان ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ط ﴿الرعد:11﴾

''بے شک خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی اندرونی حالت کو نہیں بدل لیتی''

بالفاظ دیگر کسی قوم کی حالت کی تبدیلی کا انحصار اس قوم کے افراد کی باطنی اور اخلاقی اوصاف کی تبدیلی پر منحصر ہے۔

عالمِ اسلام کے موجودہ حالات میں ان کے اُبھرنے کی یہی صورت ہے کہ بحیثیت مجموعی قرآنی ہدایت کو مضبوطی سے پکڑیں اور نسبت رسولﷺ کی مقناطیسی قوت پیدا کریں۔ جو حضورﷺ کی غلامی اختیار کرنے سے ہی ممکن ہے ورنہ ان کے زبانی دعوے اور موجودہ بے حسی اور دین سے دوری ان کو مزید تباہی کو دعوت دے سکتی ہے۔ **نعوذ باللہ من ذالک**

قناعت

فرمایا: ایک روز میں خان بہادر راجہ فضل الٰہی صاحب راولپنڈی کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرا ارادہ ہوا کہ صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر میں مریڑ حسن (راولپنڈی کا ایک محلّہ) جا کر باوا جی صاحب (حضرت مصری خاں صاحبؒ) سے ملاقات کروں۔ میں ان ہی خیالوں میں تھا کہ دروازے پر کھٹکا ہوا۔ جب دروازہ کھولا تو باوا جیؒ خود وہاں تشریف لے آئے تھے میں ان سے ملاقات کر کے بہت خوش ہوا لیکن میں نے اپنا خیال بھی ظاہر کر دیا تو فرمانے لگے کہ مجھے آپ کی راولپنڈی میں تشریف آوری کی اطلاع مل گئی تھی اس لئے میں خود ہی چلا آیا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں دو گزارشات کے لئے حاضر ہونا چاہتا تھا۔

1۔ میرے ساتھیوں کے لئے دعا فرمائی جائے۔ جو انہوں نے نہایت احسن طریقے سے فرمائی۔

2۔ میری دیرینہ تمنا ہے کہ آپ کی اس قیمتی اور پاکیزہ زندگی میں میں بھی کچھ حصہ ڈالوں لہذا میں آپ کے ذاتی مصارف ادا کرنا چاہتا ہوں۔

یہ بات سن کر حضرت باوا جی صاحبؒ مسکرائے اور فرمایا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں سکھوں کے بھٹے پر بطور منشی ملازم ہوں اور مجھے بارہ روپیہ مہینہ تنخواہ ملتی ہے جسے میں خرچ کر کر کے تھک جاتا ہوں اور وہ رقم خرچ ہونا دشوار ہو جاتی ہے۔ انہوں نے تفصیل یوں بتائی: گھر کے ماہانہ اخراجات کے لئے دونوں میاں بیوی کے لئے چار روپے درکار ہیں،

دوروپے وہ اپنی بیوہ بہن کو اور دوروپے گاؤں میں ایک یتیم بچی کو دیتے ہیں۔ دوروپے وہ اپنے پیر خانے کے لنگر میں بھیج دیتے ہیں۔ اس طرح وہ دس روپے خرچ کر سکتے ہیں۔ پھر بھی دوروپے بقایا رہ جاتے ہیں جو وہ کسی مسکین کی خدمت کر دیتے ہیں۔ مجھے تو بارہ روپے سے زیادہ کی ضرورت ہی نہیں۔ حالانکہ بھٹے والے کہتے ہیں کہ وہ میری ماہانہ تنخواہ بڑھا دیتے ہیں مگر میں نے انکار کر دیا ہے اور کئی سال سے بارہ روپے ہی لے رہا ہوں اور بفضلہٖ تعالیٰ اس پر بہت قانع ہوں۔ باوجود تقریباً 75 سال کی عمر ہونے کے وہ نہایت صحت مند اور سرخ انار کی طرح ان کا رنگ تھا اور چہرے پر ہر وقت بشاشت اور سکون کا اثر قائم تھا۔ وہ عموماً پیدل چلا کرتے تھے اور راستہ بھر میں ہندو لوگ ان کو دیکھ کر خاموش کھڑے ہو جاتے اور ان کے وہاں سے چلے جانے کے بعد اُس جگہ سے چلتے تھے۔ یہ ان کا وقار تھا اور ان کی قناعت اور ایثار کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔

لَيْسَ الْغِنٰى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرْضِ وَلٰكِنَّ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ (متفق علیہ)

''مال واسباب کی کثرت تونگری نہیں ہے اصل دولت قناعت اور بے نیازی ہے''

''نوٹ :1۔ خان بہادر راجہ فضل الٰہی صاحب راولپنڈی کے مشہور بیرسٹر تھے اور اعلیٰ حضرتؒ کے دوست اور عقیدت مند تھے۔

2۔ حضرت مصری خاں صاحب ایک درویش منش انسان تھے اور اعلیٰ حضرتؒ کے ساتھ روحانی تعلق تھا۔''

(راقم الحروف)

حرصِ دنیا

فرمایا: موجودہ زمانے میں بھوک اتنی زیادہ ہے کہ ہر شخص بھوکا نظر آتا ہے اور اس بھوک نے مختلف روپ اختیار کر رکھے ہیں۔ اکثر لوگوں کو پیٹ کی وحشت نے سرگرداں کر رکھا ہے۔ جس کے پاس دولت نہیں وہ تو روتا ہی ہے اور جس کے پاس بے حساب ہے وہ بھی پریشان ہے۔ جس کے پاس سو روپے ہیں وہ دوسو بنانے کے لئے سرگرداں ہے اور جس کے پاس ہزار ہیں وہ کئی ہزار بنانا چاہتا ہے۔ جس کے پاس لاکھ ہے وہ کئی لاکھ بنانے کی فکر میں ہے۔ اسی طرح کروڑوں والا بھی دن رات غم میں گھلا جاتا ہے۔ الغرض یہ سلسلہ ایسا نہیں جس سے کسی حد پر پہنچ کر اطمینان حاصل ہو سکے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس راستہ پر اطمینان مفقود ہے جتنی زیادہ دولت جمع ہوتی جاتی ہے پریشانی بڑھتی جاتی ہے۔

فرمایا: 1939ء میں ہندوستان کے سفر کے دوران جب میں حیدر آباد (دکن) میں مقیم تھا تو نظام دکن کا وزیر اعظم سر اکبر حیدری تھا۔ اس کی اپنی نجی جائیداد جو بمبئی، نئی دہلی اور دوسرے شہروں میں تھی کروڑوں روپے کی تھی

اوراس زمانہ میں مبلغ 30,000 روپے اُسے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور ریاست کے محصولات میں بھی اس کا حصہ تھا اس کے علاوہ بھی لاکھوں روپے کی ماہانہ آمدنی تھی۔ایک رات 11/12 بجے وہ میرے پاس مہمان خانہ میں آیا اور نہایت الحاح سے اپنی قلبی بے قراری کا ذکر کیا کہ اسے یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ اس کی موجودہ پوزیشن اور موجودہ جائیداد میں فرق نہ پڑ جائے۔ میں نے اس کی حالت دیکھ کر اسے کہا کہ انشاءاللہ آپ کی زندگی بھر یہی پوزیشن قائم رہے گی۔ چنانچہ چند سال بعد جب وہ فوت ہوا تو اس کا وہ عہدہ اور اس کی وہ تمام جائیداد اسی طرح قائم رہی بلکہ بڑھتی رہی مگر وہ خود خالی ہاتھ دنیا سے چلا گیا۔

دوسرا واقعہ بیان فرمایا: بورے والا ضلع منٹگمری (موجودہ ساہیوال) کا ایک صنعت کار جو بڑا لحیم وشحیم تھا وہ کلڈ نے کے راستے بڑی مشکل سے موہڑہ شریف پہنچا اس نے بتایا کہ وہ صبح کا چلا ہوا بمشکل عصر کے قریب پہنچ سکا ہے۔ میں نے اسے کمرے میں آرام کے لئے کہا۔اگلے روز صبح ملاقات طے ہوئی۔ چونکہ اس کی حالت دگرگوں تھی اس لئے اگلی صبح اسے بلایا گیا اور اس سے موہڑہ شریف آنے کا مقصد پوچھا تو اس نے رو کر اپنی داستان سنائی کہ اس کی کپڑے کی دو ملیں بورے والا اور لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں ہیں اور ان سے صرف 12 لاکھ روپیہ ماہانہ آمدنی ہوتی ہے یہ آمدنی اخراجات کے علاوہ ہے جو وہ اپنے بینک میں جمع کرواتا ہے اس نے بڑی کوشش کی ہے اور بہت سے جتن کئے ہیں مگر اس آمدنی میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ مستجاب الدعا ہیں اس لئے میں بڑی مشکل اور تکلیف اٹھا کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ دعا فرمائیں کہ میری یہ ماہانہ آمدنی بڑھ جائے۔ یہ سن کر میں نے دل میں خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو میری ہدایت کے لئے بھیجا ہے کہ میری مخلوق میں ایسے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کو میں نے اتنا مال فراواں دے رکھا ہے پھر بھی وہ میرے شکر گزار نہیں بلکہ وہ خواہ مخواہ اپنے آپ میں ہلکان ہو رہے ہیں۔

موجودہ زمانے کا مسلمان مذہب کو، ملت کو، قوم کو پامال کر کے ہر حیلے بہانے سے دنیا کا مال حاصل کرنے میں کوشاں ہے۔ حالانکہ انسانی ترقی اور کامیابی بھی مذہب والے مالک کے اختیار میں ہے۔مگر وہ اس سے دور ہو کر سوائے ذلت کے کچھ حاصل نہیں کرتا۔

عزیزے کہ از در گہت سر بتافت
بچ در کہ شد بچ عزت نیافت

شیطان اور نفس امّارہ

فرمایا: حضور اکرمﷺ کا ارشاد ہے:

الشیطان جَاثِمٌ عَلَی قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ فَاِذَا ذَکَرَ اللّٰہ خَنَسَ وَاِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ (بخاری شریف)

''شیطان آدمی کے دل پر جم کر بیٹھتا ہے۔ جب آدمی اللہ کا ذکر کرتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جونہی انسان ذکر سے غافل ہوتا ہے وہ وسوسے ڈالتا ہے''

معلوم ہوا کہ جب انسان اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان جو انسان کے دل پر جم کر بیٹھتا ہے اور رگوں میں خون کی طرح گردش کرتا ہے اُس سے جدا ہو جاتا ہے اور جب تک وہ انسان ذکر میں مشغول رہتا ہے اس کے قریب نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے ذکر سے غافل ہیں وہ شیطان کی گرفت میں ہیں۔

وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ ﴿الزخرف:36﴾

''اور جو کوئی خدا کی یاد سے آنکھیں بند کر لے (یعنی تغافل کرے) ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں تو وہ اس کا ساتھی ہو جاتا ہے''

جب ہم اپنے مہربان خدا سے منہ موڑ لیتے ہیں اور اس محسنِ اعظم کی یاد سے غافل ہو جاتے ہیں تو اس احسان فراموشی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم شیطان کے ساتھی ہو جاتے ہیں اور اسی کے مشورے قبول کرتے ہیں۔

فرمایا: قرآن مجید واضح اعلان کرتا ہے کہ جس پر شیطان مسلط ہوتا ہے وہ اسے اللہ کے ذکر سے غافل کر دیتا ہے۔

اِسْتَحْوَذَ عَلَیْهِمُ الشَّیْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِکْرَ اللّٰهِ ط ﴿المجادلہ:19﴾

''شیطان نے انکو قابو میں کر لیا ہے اور خدا کی یاد انکو بھلا دی ہے''

یہ قدرتی امر ہے کہ جب کوئی دشمن پر قابو پاتا ہے تو سب سے پہلے وہ دشمن سے ان ہتھیاروں کو چھینتا ہے یا تباہ کرتا ہے جو اس کے لئے ہلاکت کا سامان ہیں۔ ذکرالٰہی چونکہ شیطان کے لئے ہلاکت آفریں ہے وہ انسان پر قابو پاتے ہی اسے ذکرالٰہی سے غافل کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔

فرمایا: شیطان اور نفس امّارہ کا باہمی گہرا تعلق ہے دراصل شیطان اپنا نفس امّارہ ہی ہے جو سالک اور صوفی کو دنیاوی لذات اور دنیاوی ہواؤ ہوس کی طرف مائل کرتا ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہشات میں پھنس جاتا ہے۔ جب سالک یا صوفی اپنے نفس امارہ پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے تو پھر اس کا قدم روحانی عروج کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ﴿النحل:99﴾

''اس کا زور ان پر نہیں چلتا جو یقین رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں''

فرمایا: شیطان وہی چیز ہے جس نے عزازیل کو بھی گمراہ کیا۔ انسان اپنے نفس امّارہ کے باعث خود ہی شیطان بن جاتا ہے جبکہ اس کا رخ ماسویٰ اللہ کی طرف ہو۔ پھر عبادت وغیرہ سب طفیلی ہو جاتی ہے اور جب تک انسانی رخ ذات کی طرف رہے باقی تمام امورات طفیلی ہوتے ہیں۔

فرمایا: شیطان معاصی کو حسین اور دلفریب بنا کر پیش کرتا ہے اور اس کا حملہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان اللہ کی یاد سے غافل ہوتا ہے۔ شیطان اور گھر کے بھیدی یعنی نفس امارہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ دونوں مل کر انسان کو گمراہ کرتے ہیں۔ شیطان انسان کے دل میں وسوسے پیدا کر کے نفس امّارہ کو ابھارتا ہے اس طرح انسان راہ راست سے بھٹک جاتا ہے۔

دنیاوی غرض اور قربِ ذات کا وسیلہ

فرمایا: بسا اوقات انسان محض کسی دنیاوی غرض کے لئے کسی ولی اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے مگر وہی حاضری اس کے لئے قرب ذات کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

فرمایا: گجرات کا ایک صاحبِ جائیداد شخص ایک عورت پر دل و جان سے عاشق ہو گیا اور اس کے حصول کے لئے اپنی جائیداد تک لُٹا بیٹھا اور اِدھر اُدھر تعویذ گنڈوں کیلئے بھی دوڑ دھوپ کی کہ اسے قابو میں لائے مگر مایوسی ہوئی۔

آخر کار اسی دھن اور خیال میں موہڑہ شریف حاضر ہوا اور اپنے مدعا کے حصول کیلئے تعویذ حاصل کیا مگر اس عورت کا رویہ بدستور قائم رہا۔ آخر مایوس و بے چین ہو کر ایک مہینہ کے بعد پھر واپس آ گیا اور کہا کہ اگر یہاں کامیابی نہ ہوئی تو وہ خودکشی کر لے گا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مضبوط ارادے کا حامل ہے اگر اس کی اصلاح کی جائے تو اسکی زندگی قیمتی ہو جائے گی۔ میں نے اسے کہا کہ پہلے تو میں نے تمہارا کہنا مانا اب تم میرا کہنا مانو۔ یہ بات تسلیم کرانے کے بعد میں نے اسے ذکرِ الٰہی کی تلقین کی اور کہا کہ ایک علیٰحدہ صاف ستھرے مکان میں بیٹھ کر چالیس روز کیلئے یہ ذکرِ الٰہی کرتے رہو اور اس دوران کسی دوسری بات کی طرف متوجہ نہ ہونا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ ایک الگ صاف ستھرے مکان میں بیٹھ کر ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو گیا۔ چند دنوں کے بعد اس عورت کا دل بے قرار ہو گیا اور اس نے اپنی سہیلیوں اور عزیزوں کے ذریعہ شادی کا پیغام دینا شروع کیا۔ مگر یہ شخص تو اب ذکرِ الٰہی کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اس نے انکار کر دیا۔ بعد میں وہ عورت خود حاضر ہوئی اور شادی کے لئے اصرار کیا اور اپنا سارا زیور اور جائیداد اسے پیش کی مگر اس کی طرف سے صاف انکار رہا کیونکہ وہ اب باخدا ہو گیا تھا۔ اس سے کہا کہ اب میں ان سب باتوں سے بیزار ہو چکا ہوں۔ اب میں مالک کی نوکری میں ہوں اور اسی میں اپنی بقیہ زندگی گزار دوں گا۔ چنانچہ اس کی زندگی بدل گئی اور وہ خود بھی اللہ والا ہو گیا اور بہت سے اور لوگوں کی ہدایت کا بھی سبب بنا۔

فرمایا: کئی دفعہ ایسا ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنی کسی دنیاوی غرض یا مصیبت کی وجہ سے موہڑہ شریف حاضر ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی وہ مشکل بھی حل کر دی اور اسے قربِ ذاتی کے حصول کا طریقہ بھی مل گیا۔

ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ

حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰؑ کا واقعہ

فرمایا: سورۃ الکھف میں حضرت موسیٰؑ کی حضرت خضرؑ (جیسا کہ اکثر مفسرین کا خیال ہے) سے ملاقات کا واقعہ بیان ہوا کہ کس طرح وہ اکٹھے سفر کر رہے تھے۔ جس کشتی میں وہ جا رہے تھے اس کو حضرت خضرؑ نے توڑ دیا (کیونکہ وہ مساکین کی تھی اور عنقریب ظالم بادشاہ غصب کرنے والا تھا)۔ ایک لڑکا قتل کیا (جو سرکش تھا اس کے صالح والدین کو اللہ تعالیٰ نے ایک لڑکی عطا فرمائی جس کے بطن سے کئی انبیاء کا سلسلہ چلنا تھا) اور ایک دیوار کج کو تعمیر کیا (جس کے نیچے یتیم بچوں کا خزانہ تھا جن کا باپ ایک نیک بخت آدمی تھا)۔ حضرت موسیٰؑ نے اب سب باتوں پر ہر بار بے صبری اور گھبراہٹ سے پوچھا کہ ایسا کیوں کر رہے ہو؟ ہر بار حضرت موسیٰؑ کو حضرت خضرؑ نے صبر کی تلقین کی لیکن آخر کار ان سے نہ رہا گیا اور حضرت موسیٰؑ کو سب معاملات کی تشریح کر دی اور کہا کہ اب آپ اپنا راستہ الگ اختیار کر لیں اور دونوں جدا ہو گئے۔

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد حضرت پیر صاحبؒ نے فرمایا کہ ہر چیز کا اللہ تعالیٰ نے وقت مقرر کر رکھا ہے اور وہ اپنے وقت پر ہو کر رہتی ہے **کُلُّ اَمْرٍ مَرْھُوْنٌ بِاَوْقَاتِھَا** مثلاً ایک حقیر مرغی اپنے وقت مقررہ پر ہی انڈہ دیتی ہے چاہے سارے جہان کے علما اور سائینسدان اکٹھے ہو کر اسے درخواست کریں کہ وہ وقت سے پہلے انڈہ دیدے یا وقت سے پہلے بچے نکال دے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔

ایک روز فرمایا: سورۃ الکھف میں جو یہ قصہ بیان ہوا عموماً لوگ سمجھتے ہیں کہ خضر علیہ السلام کا علم حضرت موسیٰؑ کے علم سے افضل تھا لیکن یہ بات غلط ہے۔ خضر علیہ السلام نے جو کچھ پایا وہ علمِ مخلوق تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا علم اور جو کتاب وشریعت وہ لائے وہ علمِ الٰہی تھا لہٰذا علمِ مخلوق کسی طرح بھی علمِ الٰہی سے افضل نہیں ہو سکتا۔ یعنی محض ولایت نبوت سے فضیلت نہیں رکھتی۔

بشریت کے معاملات

فرمایا: حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمتہ اللہ علیہ جو سلسلہ نقشبندیہ کے اوائل اور سرحلقہ بزرگ ہیں ان کے متعلق مذکور ہے کہ ان کا مرتبہ حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ سے بلند تر ہے کیونکہ حضرت عبدالخالق

غجد وانیؒ شادی شدہ تھے اور حضرت بایزید بسطامیؒ مجرد تھے۔ایک دفعہ ایک شخص حضرت خواجہ عبدالخالق غجد وانیؒ کی خدمت میں مرید ہونے کے خیال سے گیا۔اس نے دیکھا کہ ان کی اہلیہ انہیں زجروتوبیخ کر رہی ہے اور ان کو جنگل سے لکڑی لانے کے لئے اصرار کر رہی ہے۔چنانچہ حضرت خواجہؒ خاموشی سے جنگل کو روانہ ہو گئے اور وہاں ضرورت کے مطابق لکڑی کاٹ کر جمع کر لی۔وہ مرید ہونے کے خیال والا شخص بھی حضرت کے پیچھے پیچھے ہولیا اور سارا واقعہ دور سے دیکھتا رہا۔کچھ دیر بعد ایک شیر جنگل سے آیا اور لکڑیوں کے ڈھیر کے قریب بیٹھ گیا۔حضرت خواجہؒ نے لکڑیاں اس کی پیٹھ پر رکھ دیں اور شیر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔گھر کے سامنے آ کر بیٹھ گیا جہاں خواجہؒ نے لکڑیاں اس کی پیٹھ سے اتار لیں اور وہ شیر جنگل کی طرف چلا گیا۔وہ شخص حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور فوراً مرید ہو گیا اور پوچھنے لگا کہ یہ تمام ماجرا کیا ہوا؟ مجھے سمجھ نہیں آئی۔حضرت خواجہؒ نے فرمایا کہ اگر میں اپنی بیوی کی تندخوئی اور ترش مزاجی کا صبر سے بوجھ نہ اٹھاؤں تو شیر میرا بوجھ کیسے اٹھائے گا؟ عالمِ خلق میں رہتے ہوئے بشریت کے معاملات کو صبر وتحمل سے برداشت کرنا چاہیے۔سالک کی اسی میں ترقی ہے۔

دوائی اور شفائے مرض

فرمایا: محض دوائی میں شفا نہیں ہوتی اگر ایسا ہوتا تو امیر آدمی جو ہر قسم کی دوائیاں استعمال کر سکتے ہیں کبھی بیمار نہ ہوتے اور جب بیمار ہو جاتے تو ماہر ڈاکٹر اور حکیموں کی دوائی سے صحتیاب ہو جاتے اور کبھی نہ مرتے۔مگر ایسا نہیں ہوتا کیونکہ شفا مالک کی طرف سے ہے اور اس کی مشیئت اسباب میں مستور ہوتی ہے دوائی میں وہی تاثیر پیدا کرتا ہے اس لئے دوائی استعمال کرتے وقت شفا کی امید مالک سے ہی رکھنی چاہیے نہ کہ دوائی میں۔

فرمایا: ایک شخص مالدار جو کہ سیالکوٹ کا رہنے والا تھا۔اللہ رکھا نام تھا۔سیالکوٹ میں بڑی جائیداد رکھتا تھا۔میرے پاس آیا۔وہ پرانا ملنے والا بھی تھا۔اسے گردے کی پتھری کی دیرینہ تکلیف تھی۔مکئی کا موسم تھا۔میں نے اسے کہا کہ مکئی کے پھول کھالیا کرو۔یہ بات اسے پسند نہ آئی بلکہ یہاں سے رخصت ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ میں اتنا پرانا حاضر ہونے والا ہوں مگر پیر صاحب نے مجھ سے مذاق کیا ہے۔غرض وہ چلا گیا۔بمبئی میں جا کر علاج کرواتا رہا۔اس پر زرِ کثیر خرچ ہو گیا مگر صحت یابی نہ ہوئی۔ایک سال کے بعد پھر حاضر ہوا اور دوبارہ عرض کی کہ میرا علاج کریں۔میں نے چھ سات سو روپیہ کا نسخہ لکھ دیا۔لیکن اب وہ سمجھ گیا۔کہنے لگا کہ آپ وہی چیز جو پہلے فرمائی تھی پھر مجھے فرما دیں۔میں نے کہا کہ وہ مشورہ تو آپ نے تسلیم ہی نہ کیا تھا۔مگر اس نے اصرار کیا تو میں نے اسے وہی مکئی کے پھول کھانے کو کہا تو وہ شخص یہ پھول کھانے سے صحت یاب ہو گیا اور پھر اسے گردے کی پتھری کی تکلیف بھی نہ ہوئی۔اب اس نے میرے مشورے پر اعتبار کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ شفا کا دارومدار دوائی میں نہیں بلکہ مالک کی مرضی میں ہے۔ میں لوگوں کو اکثر درختوں کے پتے یا پھول وغیرہ کھانے کو کہہ دیتا ہوں تو وہ شفا یاب ہو جاتے ہیں مگر میں انہیں وہی بتاتا ہوں جو خدا کی طرف سے میرے دل میں القاء ہوتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ دربار شریف میں صرف سرمہ موجود تھا وہ مریض کو دیا گیا اور وہ ٹھیک ہو گیا۔

ارشاد فرمایا: ایک زمانہ مجھ پر ایسا بھی گزرا کہ دردِ گردہ کی تکلیف ہو جاتی تھی اور اس مرض کے لئے ایک دوائی ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ ایک موقع پر جب نواب صاحب بھوپال نواب حمید اللہ خان مرحوم کے مہمان تھے اور اس کے محل میں ٹھہرے ہوئے تھے تو رات کے وقت نواب صاحب کی بیگم صاحبہ کو دردِ گردہ کی تکلیف ہوگئی۔ نواب صاحب کا کوئی خادم ہماری جگہ پر آیا کہ کوئی دوائی دی جائے۔ میں اس وقت سو رہا تھا اس لئے میرے خادم سائیں غلام محمد نے مجھے نہ جگایا اور خود ہی وہی دوا جو میں استعمال کرتا تھا نواب صاحب کے خادم کو دے دی۔ اس کے استعمال سے بیگم صاحبہ کی طبیعت اور زیادہ خراب ہوگئی اور نواب صاحب کے نوکر میرے خادم کے پیچھے پڑ گئے اور اسے بُرا بھلا کہنے لگے۔ وہ گھبرا گیا اور اس نے مجھے جگایا اور معاملہ بیان کیا۔ میں نے وہی دوائی اپنے ہاتھ سے نواب بھوپال کی بیگم صاحبہ کے لئے دی۔ مالک الملک نے اپنے کرم سے انہیں فوری شفاء بخش دی۔

فرمایا: شفا تو اللہ پاک کی بارگاہ سے آتی ہے لیکن دوائی کا ایک بہانہ ہو جاتا ہے۔

فرمایا: دربار موہڑہ شریف میں حاضر ہونا ہی باعثِ شفا ہو جاتا ہے۔ دراصل خیال کی درستی اصل چیز ہے تعویذ اور دعائیں کوئی خاص چیزیں نہیں وہ عوام کے لئے ہیں۔ جب کوئی شخص صحیح طور پر باخدا ہو جاتا ہے تو اس کا خیال ہی مالک کے کرم سے دوا بن جاتا ہے۔

راقم الحروف کا مشاہدہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو معمولی علاج بتایا گیا اور ان کی دیرینہ اور پیچیدہ بیماریاں رفع ہو گئیں۔

بے راہ روی کی اصلاح

فرمایا: اگر کسی شخص کی زندگی خراب راستے پر چل رہی ہو تو اسے یکدم روکنا نہیں چاہیے اس سے وہ ضد میں آ جاتا ہے اور اس پر وہ بضد قائم رہتا ہے۔ بہتر یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ۔ نہایت سمجھداری سے اچھی اچھی باتیں اس کے دل میں ڈالتے جائیں تو وہ خود بخود سدھر جائے گا۔ بالعموم بزرگوں کی اولاد اگر وقتی طور پر بگڑ بھی جائے تو وہ آخرکار سدھر جاتی ہے۔ لہٰذا تلقین بھی محبت اور پیار سے کرنی چاہیے۔

صداقت وکذب

حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے والے ایک ایسے شخص کا واقعہ بیان کیا جو تمام شرعی گناہوں کا مرتکب تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ چونکہ تمام گناہ تو نہیں چھوڑ سکتا البتہ وہ ایک گناہ چھوڑ دے گا۔ حضور پاک ﷺ نے فرمایا کہ جھوٹ بولنا چھوڑ دو۔ وہ وعدہ کر کے چلا گیا مگر جب بھی وہ کوئی گناہ کرنے کا ارادہ کرتا تو اسے اپنا وعدہ یاد آ جاتا تو وہ اپنی بدنامی کے خوف سے اسے چھوڑ دیتا۔ حتیٰ کہ چند دن میں اس نے تمام گناہوں سے توبہ کر لی اور اس کی بگڑی ہوئی زندگی سدھر گئی۔ حق بات یہ ہے کہ جھوٹ بولنا ساری برائیوں کی جڑ ہے اور سچ بولنا انسان کو تمام برائیوں سے بچاتا ہے۔ حضور پاک ﷺ کا قول مبارک ہے:

اَلصِّدْقُ یُنْجِیْ وَالْکِذْبُ یُھْلِکُ

''سچ باعثِ نجات ہے اور جھوٹ سببِ ہلاکت''

موجودہ زمانے میں ہمارا یہ قومی المیہ ہے کہ جھوٹ عام ہے اور صداقت سے گریز ہے۔ بات بات میں ہم اس الزام کے مرتکب ہوتے ہیں۔ انفرادی اصلاح ہو یا معاشرے کی اصلاح جھوٹ کی بُری خصلت کے ترک کئے بغیر ممکن نہیں۔

اللہ کا دروازہ

فرمایا: اللہ کا دروازہ صرف عرش پر ہی نہیں ہے وہ طُور پہاڑ پر بھی ہے (حضرت موسیٰ کا واقعہ) حقیقت یہ ہے کہ جس جگہ سے نسبت رسولی ﷺ اور معرفتِ الٰہی کا حصول ہو سکے وہیں اللہ کا دروازہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ وہ تو ہر جگہ ہر وقت موجود ہے۔ قرآن مجید نے یہ بھی بتایا: **وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ** ''وہ تو تمہاری جانوں کے اندر ہے۔ لہٰذا اس کی تلاش وہیں کرنی چاہیے۔''

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللّٰہِ تَعَالیٰ (الحدیث) ''مومن کا قلب اللہ تعالیٰ کا عرش ہے''

فرمایا: مخلوقِ خدا یہاں موہڑہ شریف میں دشوار گزار راستہ طے کر کے آتی ہے زمین پر سوتی ہے کھانے پینے میں تکلیف اٹھاتی ہے مگر چونکہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دروازے پر امید اور طمع لے کر آتے ہیں اور ان کا مالک بہت اچھا مہمان نواز ہے اس لئے وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ہمہ اوست، ہمہ از وست اور ہمہ نیست

ایک روز ارشاد فرمایا: مسئلہ ہمہ اوست اور ہمہ از وست کے متعلق بہت غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس ضمن

میں شہزادہ قدسی کا ذکر فرمایا۔ 1939ء میں ہندوستان کے سفر کے دوران لاہور میں روانگی کے وقت ایک کتاب جو شہزادہ قدسی کی لکھی ہوئی تھی کسی نے لا کر دی۔ اس میں ہمہ اوست کے مسئلہ کی توضیح کی گئی تھی۔ راستے میں دوسری کتاب بھی ملی جس میں تصوف اور سلوک کے خلاف باتیں درج تھیں۔ میں نے دونوں کتابیں سفر کے دوران پڑھ ڈالیں۔ بھوپال کے نواب صاحب نے دعوت نامہ بھیجا تھا کہ کم از کم ایک رات میں ان کے ہاں مہمان ٹھہروں۔ لیکن چند وجوہ کی بنا پر مجھے کئی دن وہاں قیام کرنا پڑا۔

اِنہی دنوں شہزادہ قدسی کا ذکر سنا تو معلوم ہوا کہ وہ بھوپال میں ہی مقیم ہیں۔ اشتیاق ہوا کہ ان سے ملاقات کی جائے۔ چنانچہ ایک عربی شخص کو جو میری خدمت میں موجود تھا سرکاری گاڑی میں ان کے پاس بھیجا۔ شہزادہ قدسی بھوپال شہر سے پندرہ بیس میل دور جنگل میں شاہی مکانوں میں رہتا تھا۔ شہزادہ نے کہا کہ وہ پرسوں دو بجے بعد دوپہر مل سکے گا۔ چنانچہ خیال آیا کہ وہ صحیح سالک نہیں کیونکہ درویشوں میں واسطہ مسکینی کا ہے اور مسکنت میں تو خاص اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔

بہرحال مقررہ وقت پر وہاں پہنچے ظہر کی نماز شہزادہ صاحب نے پڑھائی۔ تھوڑی دیر کے بعد ریاست بھوپال کے بڑے بڑے آفیسرز مثل انسپکٹر جنرل پولیس، کمانڈر انچیف، چیف جسٹس وغیرہ وہاں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ مجھے خیال آیا کہ ملاقات کا وقت تو میرا تھا۔ لیکن معلوم ہوا کہ اس شخص نے چال چلی ہے وہ اپنے ملنے والوں پر رعب ڈالنا چاہتا ہے کہ جس ہستی کی ملاقات کے لئے نواب صاحب بھوپال خود حاضر ہوتے ہیں وہ تو اُسے ملنے کے لئے آج خود یہاں موجود ہے۔

چائے نوشی کے بعد شہزادہ قدسی نے تقریر شروع کی اور ہمہ اوست کا مسئلہ بیان کرنے لگا۔ اور اپنے ملنے والوں سے داد لینے لگا۔ دورانِ تقریر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا کہ یہ سچ ہے نا؟ میں نے کہا یہ درست نہیں اور غلط ہے۔ جو دلائل ''فصوص الحکم'' میں حضرت ابن العربیؒ نے بیان فرمائی ہیں وہ ہمارے لئے حجت نہیں ہوسکتیں۔ صریح آیتِ قرآنی موجود ہے کہ

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ٥ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴿الرحمن:27-26﴾

''جو (مخلوق) زمین پر ہے سب کو فنا ہونا ہے اور تمہارے پروردگار ہی کی ذات (بابرکت) جو صاحب جلال وعظمت ہے باقی رہے گی''

صاف ظاہر ہے کہ باقی فانی میں کیسے سما سکتا ہے؟ اور وہ ایک کیسے ہوسکتے ہیں؟

شہزادہ قدسی نے فوراً پہلو بدلا اور ہمہ اوست کی بجائے ہمہ از وست کا ذکر شروع کر دیا میں نے کہا یہ بھی

درست نہیں ہے کیونکہ اس کے ماننے سے ذات میں **تکاثر** اور **تجزّی** لازم آتا ہے اور ذات **تو لَا یَتَجَزّی** اور **لَا یَتَکَاثُر** ہے اور یہ ممتنع ہے لہذا یہ بھی صحیح نہیں۔ ہمارے لئے صرف ایک ہی بات قابل قبول ہے اور وہ ہمہ نیست ہے جس کے حصول کا ذریعہ نسبت رسولﷺ ہے۔

اس پر حاضرین اُٹھ کھڑے ہوئے اور شہزادہ قدسی کا کھیل ختم ہوا۔ حاضرین میں سے ابراہیم خان جو انسپکٹر جنرل پولیس تھا اور بہت چالاک اور پڑھا لکھا شخص تھا کہنے لگا کہ شہزادہ صاحب! آپ تو خود حضرت صاحبؒ سے تعلیم حاصل کریں۔ اور مجلس برخاست ہوگئی۔ شہزادہ صاحب کی کیفیت **یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرَابًا** والی ہوگئی۔

فرمایا: حضورﷺ کے اصحابِ کبار دریائے احدیت میں مچھلیوں کی طرح تیرتے تھے اور کسی قسم کا میل ان میں نہیں تھا۔ لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ ماسوئ اللہ کی شمولیت کی میل آئی۔ لفظ شریعت پر بحث اور جھگڑے ہوئے۔ علماء کے گروہ بنے اور یہی چیز مقصود بالذات سمجھی جانے لگی اور فلسفیانہ تاویلات اور بحثیں شروع ہوگئیں۔ ان غلط تصورات کی درستی کے لئے بحکم الٰہی ہمہ اوست (ہر چیز وہی ہے) کا مسئلہ سامنے آیا جسے حضرت ابن العربی رحمتہ اللہ علیہ نے فصوص الحکم میں بیان فرمایا۔ لیکن مرورِ زمانہ سے اس میں افراط تفریط ہوئی تو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ہمہ از اوست (ہر چیز اسی کی طرف سے ہے) کا مسئلہ پیش کر دیا۔ لیکن یہ دونوں فلسفیانہ مسئلے راستے کی باتیں ہیں۔ دور گئے ہوؤں کو قریب لانے کے طریقے ہیں۔ اصل میں ذاتِ الٰہی وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے جہاں ہر چیز (مخلوق اور حادث) کی نفی ہے اس لئے حقیقت ہمہ نیست ہے۔ یعنی ہر چیز کچھ نہیں اور فنا ہونے والی ہے۔ محض ذاتِ احدیت ہی قائم و دائم اور باقی رہنے والی ہے۔

ذاتی استعداد

فرمایا: ہر انسان کی ذاتی استعداد جدا جدا ہوتی ہے اور یہی بنیادی چیز ہے جیسے انسانوں کی ظاہری جسمانی حالت جُدا جُدا ہوتی ہے یہی اس کی ذاتی استعداد ہے۔ ہر ایک کے ساتھ اس کی سمجھ کے مطابق بات کرنی چاہیے۔

ہمارے پاس کئی قسم کے لوگ آتے ہیں۔ ان کو سمجھانے کیلئے جب باتیں کی جاتی ہیں تو وہ ان کو ایک وعظ سمجھ کر سن چھوڑتے ہیں اور ان کو اپنے دل میں جگہ نہیں دیتے۔ ایسے لوگوں سے ہم لوگ اپنی چیز واپس لے لیتے ہیں اور وہ کورے کے کورے رہ جاتے ہیں۔ جیسے جوہری ہر جوہر کی قیمت جانتا ہے اور اسی حساب سے اس کی قیمت لگاتا ہے مثلاً فرمایا: یہاں چار بند صندوقچیاں پڑی ہوں جو ایک رنگ اور ایک سائز کی ہوں مگر ان کے اندر کوئلہ، چاندی، سونا اور پنا جدا جدا بند کیا گیا ہو تو اگر چہ ظاہری طور پر ان صندوقچیوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا لیکن جوہری ان کی قیمت سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ قیمتی صندوقچی کونسی ہے اور باقی درجہ بدرجہ کونسی ہیں۔ اسی طرح ہر انسان کی

قیمت اس کی ذاتی استعداد کے مطابق ہوتی ہے اور اہل شناخت اس کو بخوبی سمجھتے ہیں اور ہر ایک سے اس کی عقل اور سمجھ کے مطابق سلوک کرتے ہیں۔ رسول خدا ﷺ کا ارشاد ہے۔

كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ

''لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق بات کرو''

فرمایا: ذاتی استعداد ایک فطری امر ہے باوجودیکہ حضرت ابوہریرہؓ و دیگر اصحاب رسول ﷺ نے پوری پوری رفاقت کی مگر وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علی المرتضی رضوان اللہ علیہم کے درجات کو نہ پہنچ سکے۔ یہی حال ہر زمانے میں ہر گروہ کا ہے جو تا قیامت قائم رہے گا۔ ذاتی استعداد کے لحاظ سے لوگ موصل، زود موصل اور غیر موصل ہوتے ہیں اور ان کی یہی استعداد ان کی زندگی میں فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے۔ اہل باطن انکی اس مخفی طاقت کو نظر میں رکھ کر ان سے برتاؤ کرتے ہیں۔

عیسائیت اور اسلام

فرمایا: جب میں حیدر آباد دکن میں ٹھہرا ہوا تھا تو پانڈیچری کے ریذیڈنٹ صاحب نے ملاقات کے لئے دعوت نامہ بھیجا۔ تو میں ملاقات کے لئے وہاں چلا گیا۔ وہ شخص ایک بڑا عیسائی عالم بھی تھا۔ اس سے چند ملاقاتوں میں اچھی اچھی باتیں ہوئیں۔ ایک روز ملاقات کے دوران اس نے ایک شکل بنائی اور میرے سامنے کاغذ رکھ دیا اور میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔ یہ یونانی زبان میں حروف تہجی کا آخری حرف **(♎)** تھا جسے اومیگا (Omega) کہتے ہیں۔ عیسائی لوگ صلیب (+Cross) کے نشان کے علاوہ اومیگا (Omega) کا نشان بطور عیسائیت کے نشان (Symbol) استعمال کرتے ہیں جس کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ عیسائیت آخری اور بہترین دین ہے اور صلیب انسانیت کے گناہوں کے کفارہ کا اظہار ہے۔ اس وقت ریذیڈنٹ صاحب نے یہ دونوں نشان پہن رکھے تھے۔ میں اس کا مدعا سمجھ گیا۔ میں نے اسی شکل سے ملتی جلتی ایک اور شکل بنا دی اور اس میں ایک قوس کا اضافہ کر دیا **(♎)** جو قوس احدیت ہے یہ ایک اجمالی نقشہ ہے۔ خارج میں ذات لاتعین ہے جو ذات بحت ہے اس ذات اور حقیقت میں کوئی تغیر و تبدل واقع نہیں ہوتا ''اللہ تھا اور کوئی شے اس کے ساتھ اس کے علاوہ نہ تھی''۔ **كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَعَهٗ شَيْئًا** اور اب بھی اسی طرح ہے جس طرح کہ تھا (**اَلْاٰنَ كَمَا كَانَ**) وہ نہ جوہر ہے نہ عرض ہے **بعینہٖ و بذاتہٖ** موجود ہے اور کسی دوسری چیز سے جو **ذهناً** یا **خارجاً** ہے مغائرت رکھتی ہو موجود نہیں وہ بے مثل و بے مثال ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿الشوریٰ: 11﴾

حق نے سب سے پہلا تنزل حقیقتِ محمدی ﷺ میں فرمایا جو قوس احدیت سے دکھایا گیا ہے محمد ﷺ کا فرمان ہے **اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰہِ نُوْرِیْ** یعنی پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی وہ میرا نور ہے۔ بلحاظ تخلیق آپ ﷺ اوّل بلحاظ اظہار آپ آخر ہیں۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے وہ نور ہیں جو سب سے پہلے چمکا اور جس سے جملہ کائنات کی تخلیق ہوئی۔ آپ ﷺ اصل ہیں جملہ کائنات کی اور آپ ہی حقیقت ہیں آدمؑ کی اور آپ ہی اصل ہیں جملہ انبیاء کی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے عیسائی مذہب نے فراموش کر دیا ہے۔

فرمایا: وہ شخص نہایت زیرک تھا اس شکل کے متعلق اس نے کوئی بات چیت نہ کی البتہ اسلام کے متعلق اس نے بڑے گہرے سوالات کئے جن کے شافی جوابات دیے گئے اور وہ بہت متاثر ہوا اور اس نے میری بہت عزت افزائی کی۔ بعد میں بھی اس کی خط و کتابت مجھ سے جاری رہی اس کا رُخ اسلام کی طرف ہو گیا تھا۔ **(وَاللّٰہُ اَعْلَمُ)**۔

فرمایا: ہمارے اہل علم طبقہ کو ہر قسم کا علم سیکھنا چاہیے تاکہ ان پر کوئی غیر مذہب غالب نہ آ سکے۔

تکوین اور تصرف

فرمایا: جس خوش نصیب شخص نے اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے اللہ تعالیٰ کے دین میں کوشش کی اور صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہا اور وہ طریقہ اختیار کیا جس پر رسول خدا ﷺ تھے اور اپنے جذبات اور خواہشاتِ نفس کو اپنے مالک کی رضا پر قربان کر دیا تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو منور کر دیتا ہے اور اسے قربت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس وقت اسے مالک کی طرف سے مرتبۂ تکوین حاصل ہوتا ہے اور اس کی حالت اَور ہو جاتی ہے۔ جو خیال اس کے دل میں آتا ہے ویسا ہی ہو جاتا ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

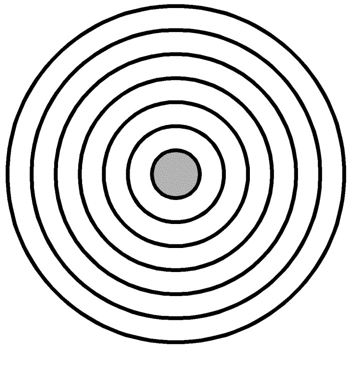

پھر نقشہ بنا کر سمجھایا کہ جیسا کہ مرکزی نقطہ کے گرد چند دائرے ہیں اور ایک دائرہ دوسرے سے بڑا ہوتا جاتا ہے لیکن مرکزی نقطہ سے جملہ دائروں کا تعلق قائم رہتا ہے اسی طرح قلبِ انسانی کو امورِ تکوین (جو من قبیل کن فیکون ہے) سے عزت ملتی ہے اس طاقت سے دنیاوی معاملات اس کے تصرف میں آ جاتے ہیں۔

فرمایا: حضرت قبلہ عالم نظام الدین کیہاں شریفؒ نے کبھی کسی کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کی۔ مگر ان کے تصرفات کے بیشمار واقعات ہیں جو احاطہ تحریر میں نہیں آ سکتے۔ ان کے تصرف کا ایک واقعہ درج ذیل ہے:

ریاست کشمیر کی رہنے والی ایک عورت جس کے دو بچوں کو سیشن کورٹ سے پھانسی کا حکم ہوا تھا دربار شریف میں اس کے حاضر ہونے کا واقعہ بیان فرمایا۔ پہلی بار حضرت قبلہ عالمؒ نے فرمایا کہ سکھے کی بچی (یہ ان کا تکیہ کلام تھا) چلی جائے اس کے بچے بچ جائیں گے لیکن پھانسی کا حکم کشمیر ہائی کورٹ نے بھی دے دیا تو وہ عورت روتی ہوئی پھر حاضر ہوئی۔ فرمایا کہ چلی جائے بچے بچ جائیں گے۔ مگر رحم کی اپیل بھی خارج ہوگئی اور وہی عورت چیختی چلاتی حاضر ہوئی کہ میں اسی دربار میں جان دے دوں گی کیونکہ جب میرے بچوں کو ہی پھانسی چڑھا دیا جائے گا تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گی۔ سرکار کیانوی رحمتہ اللہ علیہ اُس روز باہر تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں وہ عورت چیختی چلاتی سامنے آئی تو سرکار کیانوی رحمتہ اللہ علیہ نے دریافت فرمایا کہ پھانسی کیا چیز ہوتی ہے؟ ان کے ایک خادم نے جو بھینس کے چارہ کا انتظام کر رہا تھا اس نے فوری طور پر ایک تھمے (ستون) کے ساتھ دو لکڑیاں اور گھاس کا ایک رسہ بنا کر پھانسی کی ایک صورت بنائی اور بتایا کہ ملزم کو اس رسے سے لٹکا دیا جاتا ہے اور وہ مر جاتا ہے۔ سرکارؒ نے ایک کلہاڑی ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ عورت اس لئے روتی ہے اور اس رسے کو کلہاڑی سے توڑ دیا اور خود آگے چلے گئے۔ وہ عورت تو وہیں بیٹھ گئی اور کہنے لگی کہ میں تو اب یہاں سے بالکل نہیں جاؤں گی میں تو یہاں مرنے ہی کے لئے آئی ہوں۔

اگلے روز دونوں لڑکے بھاگتے ہوئے وہیں آن پہنچے۔ انہوں نے بتایا پھانسی تین روز کے بعد ہونی تھی۔ دفعتاً ایک بزرگ آئے انہوں نے کلہاڑی مار کر قید خانے کا دروازہ توڑ ڈالا۔ ہم نے دیکھا کہ دروازہ ٹوٹا ہوا ہے ہم وہاں سے بھاگے اور ایسے بھاگے کہ دربار شریف کا رخ کیا اور یہاں پہنچ گئے۔ یہ قبلہ عالم رحمتہ اللہ کا تصرف تھا۔

حقیقت اس امر کی یہ ہے کہ اس صورت میں جب انسان روبہ حق ہو بشریت مغلوب اور مقفل ہو جاتی ہے اور ملکیت حاکم اور عامل ہوتی ہے۔ ملکیت زیرِ احدیت ہوتی ہے اور سالک کی حرکات وسکنات **فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ** کی طرف سے ہوتے ہیں گویا جو چیز اس وقت اس ذہن میں آتی ہے اس پر عملِ تکوین جاری ہوتا ہے۔ یہ تکوین من قبیل کن فیکون ہے۔

موہڑہ شریف میں سات دن

راقم الحروف مئی 1951ء میں بیعت ہونے کے بعد کوشش کرتا رہا کہ اعلیٰ حضرتؒ کی خدمت عالیہ میں بار بار حاضری نصیب ہوتی رہے۔ **الحمد للہ** کئی مواقع حاصل ہوتے رہے مگر موہڑہ شریف میں قیام کا موقع دو تین ایام سے زیادہ کبھی نہ مل سکا۔ خوش بختی سے اگست 1957ء میں ایسا موقع بھی نصیب ہوا۔ راقم الحروف کے خسر شمس الخلفا جناب ڈاکٹر عنایت اللہ سلیمی صاحب اور میرے بیوی بچوں نے ارادہ کیا کہ اس بار کم از کم ایک ہفتہ اعلیٰ حضرتؒ کی خدمت اقدس میں حاضر رہیں گے۔ **الحمد لله** 25 اگست 1957ء سے 31 اگست 1957ء تک یہ حاضری نصیب ہوئی۔ اعلیٰ حضرتؒ بھی نہایت خوش ہوئے اور ہمیں صبح سے دو پہر تک اور عصر کے بعد اکثر اوقات اپنے قیمتی ارشادات سے نوازتے رہے۔

راقم الحروف کی خوش قسمتی ہے کہ یہ تمام ارشادات قلم بند کر لئے گئے۔ کیونکہ جناب ڈاکٹر سلیمی صاحبؒ کی اعانت بھی حاصل تھی جو عالم، فاضل اور اہل نظر ہستی تھے۔ موہڑہ شریف میں قیام کے آخری روز یہ قلمی ارشادات اعلیٰ حضرتؒ کی خدمت میں پیش کئے تو ان میں سے چند راقم الحروف سے سنے اور مسرت فرمائی اور فرمایا کہ پیر احسن الدین اور حاجی صاحب بھی تحریر کر لیتے ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔

یہ ارشادات برادرانِ طریقت کے استفادہ کے لئے مختصراً کتاب ہذا میں بھی شامل کئے جاتے ہیں۔

1۔ مُوْتُوْ قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا

فرمایا: یہ زندگی عارضی ہے اس میں ہر وقت حضوری رہنا چاہیے یعنی جہاں موت کے بعد جانا ہے اس کا استحضار ہر دم رہے اور اپنے آپ کو وہیں بیٹھا ہوا دیکھے اور طبعی موت کے وارد ہونے سے قبل اس مقام میں ہو یہی مدعا **مُوْتُوْ قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا** کا ہے۔ تا کہ اس عارضی زندگی کو گزار کر جب اس پر موت وارد ہو تو اپنے اصلی مقام پر سیدھا پہنچ جائے۔

2۔ موجودہ زندگی کی اہمیت

فرمایا: مالک کی رضا کے لئے کام صرف اِسی دنیا کی مختصر زندگی میں ہو سکتے ہیں۔ یہ موقعہ اسے کسی اور جگہ نہیں مل سکتا۔ اس لئے اس موقعہ کو غنیمت سمجھتے ہوئے اپنی زندگی واصل بحق اور مخلوق خدا کی خدمت میں گزارے۔ موجودہ زندگی کا وقت نہایت قیمتی ہے۔ اسے غفلت میں نہیں گزار دینا چاہیے۔

3۔ استدراجی علوم

فرمایا: میں نے ایک کتاب **''مکالمہ نظیر''** لکھی تھی جس میں مسمریزم، ہپناٹزم، ٹیلی پیتھی وغیرہ کی حقیقت پر

بحث کی تھی۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ انگلینڈ بھیجا گیا تو وہاں کے لوگوں کے لئے یہ عجیب چیز تھی ان کا خیال یہ ہے کہ (Godly Power) کوئی شئے نہیں ہر چیز تو ذاتی طاقت (My Power) ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام انبیاء اور اولیاء کے پاس یہی ذاتی طاقت تھی جس سے وہ معجزات اور کرامتیں لوگوں کو دکھاتے تھے اور جس کے ساتھ وہ آج کل خود مختلف شعبدے بازیاں مثل مسمریزم، ہپناٹزم، ہیلنگ پاور وغیرہ کر لیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے اپنی خصوصی مشقوں سے ارتکازِ توجہ کی قوت پیدا کر کے اپنی نفسیاتی قوت ارادی کو تقویت دے کر شعبدہ بازی اور خوارق عادت باتیں پیدا کی ہیں۔ مگر یہ سب ادنیٰ درجے کی باتیں ہیں۔ بخلاف ان کے اولیاء اللہ اور انبیائے کرام نے اپنی نفسانیت (نفس وارادہ) کی نفی کی اور سلوک کی تربیت سے واصل بحق ہوئے۔ اتصال تام کے باعث ان میں خدائی طاقت اور خدائی ارادہ کارفرما ہوا اور ان سے جو کچھ ظہور میں آیا وہ اسی طاقت اور ارادہ کے ماتحت ہوا۔ اگرچہ ظاہری صورت ایک جیسی نظر آئے مگر ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ مرتبۂ تکوین حاصل کرے جس کے لئے نسبت رسولی ﷺ کو مضبوط کرنا بنیادی شرط ہے۔

4۔ ملاّ سیف الدین طاہر اور اس کا حسنِ سلوک

فرمایا: ملاّ سیف الدین طاہر (جو شیعہ فرقے کے بمبئی میں بڑے لیڈر تھے) ان کے حسن سلوک کی بہت تعریف کرتے ہوئے فرمایا میں نے محبت اور احسن طریقہ سے بہت سی قیمتی باتیں ملاّ صاحب کو بتائیں جو انہوں نے اپنے سلسلہ میں داخل کیں اور کربلائے معلیٰ میں بھی انہیں رائج کیا۔ وہاں سے دو خلعتیں میرے لئے بھیجی گئیں۔ حکم الٰہی ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ﴿النحل : 125﴾

''اے پیغمبر! لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے راستے کی طرف بلاؤ''

اگر میں بھی عام مولوی صاحبان کی طرح درشت وشدید رویہ اختیار کرتا تو اصلاحی باتیں جو میری وجہ سے شیعہ صاحبان نے اپنائیں وہ نہ ہو سکتی تھیں اور ایسے تعلقات بھی قائم نہ رہ سکتے تھے۔ وہ میرے ذاتی دوست تھے۔

بمبئی سے رخصت ہونے کا واقعہ بیان فرمایا کہ ملاّ سیف الدین طاہر صاحب نے مبلغ پچاس ہزار روپے مجھے پیش کئے لیکن میں نے نہ لئے اور جواب دیا کہ پیری میرے پاس امانت ہے اور میری اپنی چیز نہیں ہے۔ اس لئے میں یہ رقم قبول کر کے کسی کے زیر بارِ احسان نہیں ہونا چاہتا۔ میرے ساتھی مجھ سے بہت ناراض ہوئے۔ اس وقت میرے پاس صرف ساڑھے تین روپے تھے۔ جب باوجود اصرار کے میں نے روپے نہ لئے تو ملاّ صاحب نے میرے ساتھ اپنے دو آدمی بھیجے تاکہ وہ میرے آرام کا خیال رکھیں اور مجھے موہڑہ شریف تک چھوڑ کر آئیں۔

5۔ذات کا طمع

فرمایا: ہمیشہ اللہ کی ذات سے طمع رکھنی چاہیے اور وہ ذات اپنے سے امید رکھنے والے انسان کو کبھی مایوس نہیں ہونے دیتی۔ اسی ضمن میں ایک بزرگ کے بچے کا ذکر کیا کہ اس کی والدہ دیوار کے ایک طاقچے میں میٹھی چیز رکھ دیتی اور بچے سے کہتی کہ وہاں جا کر اللہ سے مانگو۔ چنانچہ وہ اس کا روزانہ کا معمول ہو گیا۔ ایک دن اس کی والدہ کوئی مٹھائی نہ رکھ سکی اور بچے نے حسب معمول وہاں جا کر اللہ سے مانگی تو اللہ نے قدرت کاملہ سے وہی چیز وہاں مہیا کر دی۔

6۔سالک کا فرض

فرمایا: بیعت ہونے کا مدعا ایک مضبوط معاہدہ ہے کہ میں اللہ کے رستے میں سر دھڑ کی بازی لگاؤں گا اور ہر ایک غلط خیال اور نظریئے کے خلاف جہاد کروں گا۔ اس جہاد میں خواہ کسی کی مخالفت پیش آئے اس سے بے پرواہ ہو کر اپنی رفتارِ زندگی کو درست رکھوں گا۔ اس لئے بیعت ہونے کے بعد اپنی ذاتی رائے کو فنا سمجھے اور رفتارِ زندگی کو ہر قیمت اور ہر تکلیف سے قطع نظر کر کے درست رکھے اور لوگوں کو اس رستہ کی تعلیم بھی دیتا رہے۔ گناہوں کا معاف ہونا تو نہایت معمولی بات ہے اور ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ اگر ہم گناہ نہ کرتے تو وہ **غفور الرحیم** کیسے کہلاتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کی بھٹکی ہوئی مخلوق کو اس کا رستہ محبت اور پیار سے احسن طریقہ سے بتایا جائے۔ جیسا کہ حکم الٰہی ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ﴿النحل : 125﴾

''آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم وحکمت اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ بلائیے اور ان کے ساتھ احسن طریقہ سے بات چیت کیجئے''

7۔صوفی کا فرض

فرمایا: صوفی کا فرض ہے کہ وہ خود بھی مرکزی دائرہ میں قائم رہے اور اپنے ساتھیوں کو بھی اسی دائرے کی تعلیم دے۔ وہ بیرونی دائروں میں سے کسی میں بھی نہیں الجھتا۔ وہ تو مرکزی دائرہ میں ہی قرار پاتا ہے۔ وہ تو ہر اچھی بات کو اختیار کرتا ہے اور بری بات کو چھوڑتا جاتا ہے۔ صوفی کے لئے وسیع القلب ہونا نہایت ضروری ہے۔

8۔دینی اختلافات

فرمایا: ہندوؤں کا کوئی پختہ مذہب نہیں۔ان کے پاس دین کی جو مسخ شدہ صورت ہے وہ چند اوہام اور رسوم کا مجموعہ ہے۔لیکن وہ قوم ان غلط سلط باتوں کے باوجود منظّم ہے اور ان میں کبھی فرقہ ورانہ فساد نہیں ہوتے۔اور اگرچہ یہودیوں کے پاس بھی تورات مسخ شدہ صورت میں ہے پھر بھی وہ متحد رہتے ہیں۔مگر ہمارے بعض مولوی صاحبان نے محض فروعی مسائل کی بنا پر امت کو لڑائی اور دنگا فساد میں مبتلا کر رکھا ہے اور یہ غیر مسلموں کی نگاہ میں مذہبِ اسلام کی تضحیک کا باعث بنتے ہیں۔

9۔دعا

فرمایا: دعا تو ہر ایک کرتا ہے یہاں تک کہ کافر بھی بلکہ کافروں کے سردار یعنی شیطان لعین نے بھی دعا کی۔ مالک نے وہ دعا بھی قبول فرمائی۔ دعائیں تو ہر ایک کرتا ہے لیکن مالک سے دعا مانگنے کا طریقہ بھی آنا چاہیے۔ سرورِ کائنات ﷺ کی غلامی قبولیتِ دعا کی کنجی ہے۔

10۔قلبی کیفیت

فرمایا: عبادت بہت اچھی بات ہے بالخصوص مکہ شریف میں حاضر ہو کر شب و روز عبادت کرنا تو بہت اچھی چیز ہے مگر اگر قلب میں تبدیلی نہ آئے تو ایسی عبادت بیکار ہے۔قلب کے اندر کی کیفیت کو تبدیل کرنا ضروری ہے۔ اللہ کا فرمان ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ‌ؕ ﴿الرعد: 11﴾

''بے شک خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی اندرونی حالت نہ بدلے''

قلب میں اللہ اور رسول پاک ﷺ کی محبت و عشق کی گرمی پیدا ہونا ضروری ہے اگر یہ بات پیدا ہو جائے تو ہر حرکت عبادت بن جاتی ہے جو مقبول عبادت ہے۔

11۔محنت کی بنیاد

فرمایا: ہر ایک کو محنت کے تناسب سے مزدوری نہیں ملتی مثلاً گدھا سارا دن محنت شاقہ کرتا ہے مگر اس کا مالک اسے پیٹ بھر کر کھانے کو بھی نہیں دیتا۔اس کے برعکس ایسے گھوڑے بھی ہیں جن کی خدمت کے لئے کئی کئی آدمی مقرر ہوتے ہیں اور ان کی خوراک بھی اتنی قیمتی ہوتی ہے حالانکہ وہ گھوڑا بہت کم محنت اور وہ بھی کبھی کبھی کرتا ہے۔

اگر محنت معیار ہوتی تو معاملہ الٹ ہوتا۔ اسی طرح ایک مزدور دن بھر روڑی کوٹتا ہے تو چند روپے لیتا ہے۔ مگر فوج کا کمانڈر انچیف چند منٹ کام کرتا ہے تو کئی ہزار روپے لیتا ہے۔ اسی طرح اردلی بینچ پر بیٹھا رہتا ہے اور شب و روز خدمت کرتا ہے مگر بمشکل چند سو روپیہ ماہانہ ملتا ہے۔ مگر صاحب بہادر تھوڑی دیر کام کرتا ہے اور ہزاروں روپیہ تنخواہ لیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کارخانے میں صرف محنت ہی معیار نہیں بلکہ صحیح سمجھ اور عقل و شعور سے محنت درکار ہے۔

12 خدمت کا صلہ

فرمایا: آپ کے ذمے کچھ کام ہیں اور ہمارے ذمہ بھی کچھ کام ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم آپ کی خدمت کریں کیونکہ آپ اللہ کی مخلوق ہیں۔ ہم آپ کی خدمت کرتے ہیں کہ ہمارا مالک راضی ہو جائے۔ فرمایا: اگر کوئی عام آدمی بادشاہ کو خوش کرنا چاہے تو وہ اس کے اصطبل میں جا کر اس کے گدھوں، گھوڑوں کی خدمت کرے۔ جب بادشاہ اپنے جانوروں کو اچھی حالت میں دیکھے گا تو ان کی خدمت کرنے والے کے متعلق دریافت کرے گا اور اس وجہ سے بادشاہ اس شخص پر خوش ہو جائے گا۔ ورنہ بادشاہ تک اس کی رسائی محال ہے۔

13 ضیائے ربانی اور انسان

فرمایا: کائنات کی ہر چیز اپنے مالک کی حمد و ثنا کرتی ہے۔

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴿التغابن:1﴾

''جو چیز آسمانوں میں ہے اور جو چیز زمین میں ہے سب خدا کی تسبیح کرتی ہے''

چنانچہ خنزیر اور کتے بھی نماز پڑھتے ہیں ان کا بھی وضو ہے مگر ان کی نماز اور وضو کی صورت دوسری نوعیت کی ہے یہی حال تمام مخلوقِ خدا کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل تو تمام مخلوق کر رہی ہے لیکن ضیائے ربانی کے حصول کے لئے صرف انسان کو ہی بنایا گیا ہے اور اسے وہ چیز عطا ہوئی ہے کہ جس کے ٹھیک استعمال سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو سکتا ہے اور وہ نسبت رسولی ﷺ ہے۔ وہ جتنی دنیاوی تکلیف، آسائش و آرام یا بوجھ وغیرہ سب کچھ برداشت کرتے ہوئے مالک کی حاضری میں پہنچتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ و درجہ اتنا ہی بلند فرماتے ہیں۔ مومن کے لئے اس راستے کی ہر تکلیف یا بوجھ باعثِ ترقی ہے۔

14۔ پیوستگی اور روشنی

فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو کچھ پیدا کیا ہے وہ کسی دوسری غرض کے لئے ہے مگر انسان کو اس نے اپنی معرفت کے لئے پیدا کیا ہے۔ برتنوں کی دکان کی مثال فرمائی۔ دکان میں ہر برتن کسی دوسری غرض کے لئے ہے مثلاً

پلیٹ، پیالی، گلاس وغیرہ۔مگر ایک برتن یعنی بلب صرف اس لئے ہے کہ اس میں روشنی پیدا ہو اگر اس میں روشنی نہ آ سکے تو وہ بلب بے کار ہے۔اگر یہاں ایک ہزار بلب پڑے ہوں تو سب ایسے ہی پڑے رہیں گے اور ان میں کبھی روشنی خود بخود نہیں آ سکے گی۔مگر ایک ہاتھ کسی بلب کو اٹھا کر بجلی کے پوائنٹ کے ساتھ پیوست کر دے اور سوئچ آن (Switch) کر دے تو پیوستگی ہوتے ہی اُس بلب میں روشنی آ جائے گی بشرطیکہ اس کی اندرونی تاریں ٹھیک ہوں۔اسی طرح جو شیخِ طریقت کی وساطت سے کسی شخص کی نسبت رسولی ﷺ سے پیوستگی ہو جاتی ہے تو اس کے قلب (جو بمنزلہ بلب ہے) اس میں انوارِ الٰہی کا نزول شروع ہو جاتا ہے اور وہ منور ہو جاتا ہے۔مثالاً فرمایا کہ سورج جب ایک آئینے میں منعکس ہونے لگتا ہے تو اس چھوٹے سے آئینہ میں سورج کے اثرات آ جاتے ہیں۔صرف اس کی شعائیں ہی منعکس نہیں ہونے لگتیں بلکہ اس کی گرمی کا بھی اثر نمایاں نظر آنے لگتا ہے۔

15۔صحیح خیال

فرمایا: آپ لوگ تکالیف برداشت کر کے صرف ہماری محبت کی خاطر آئے ہیں اگر آپ یہاں صرف ہمارے لئے آئے ہیں تو یہ درست نہیں اور اگر ہم یہ سمجھیں کہ آپ ہمارے لئے آئے ہیں تو یہ بھی درست نہیں۔مثالاً فرمایا کہ نمازی اگر یہ سمجھیں کہ امام کو سجدہ کرتے ہیں یا اس کی نماز پڑھتے ہیں تو یہ شرک اور کفر ہوگا۔اسی طرح اگر امام یہ سمجھے کہ یہ لوگ مجھے سجدہ کرتے ہیں یا میرے لئے جمع ہوئے ہیں تو یہ بھی کفر ہو جائے گا لہذا خیال کا صحیح ہونا نہایت ضروری ہے۔جب بھی آپ یہاں آئیں نسبت رسولی ﷺ کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لئے آئیں اس طرح آپ کا یہاں آنا اور جانا بھی عبادت ہو جائے گا۔

16۔تعلق باللہ

فرمایا: آپ لوگ اللہ کے دروازے پر آئے ہیں وہ بہترین مہمان نواز ہے اور اپنے بندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔اس کے راستہ میں جو تکلیف اٹھائی جائے وہ بڑی قیمتی ہے اس کا صلہ ضرور ملتا ہے۔آپ ایسی جنس کی خرید کے لئے آئے ہیں جس کی اللہ کی مارکیٹ میں مانگ ہے اور وہ قیمتی ہے اور وہ نسبت رسولی ﷺ کے ذریعہ تعلق باللہ اور معرفت الٰہی کا حصول ہے۔لہذا ہمارا فرض ہے کہ ہم جو بھی اس خیال سے ہمارے پاس آئے اُسے یہ جنس دیں۔لہذا ہم ایسے تمام اصحاب کو (خواہ وہ سمجھیں یا نہ سمجھیں) اس دروازے پر یعنی چشمہ معرفت تک پہنچا دیتے ہیں اور وہ اس سے سیراب ہوں یا نہ ہوں یہ ان کی اپنی سعی و کوشش اور قسمت پر منحصر ہے۔

17۔قلبِ انسانی

فرمایا: انسانی نگاہ سمجھ، شعور سب محدود ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کی ذات جو غیر محدود ہے کیسے سما سکتی ہے لیکن وہ

انسانی قلب میں موجود ہے چونکہ ہمارے قلوب گرد آلود ہوتے ہیں اس لئے اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوتا ورنہ گبروترسا، مومن وکافر کی تخصیص نہیں جو اس گرد کو نسبت رسولی ﷺ اختیار کر کے دور کر لیتے ہیں وہ اس کے آثار محسوس کر لیتے ہیں۔ حدیث مبارکہ میں ہے:

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللهِ تَعَالیٰ ''مومن کا قلب اللہ تعالیٰ کا عرش ہے''

18۔انسانی سمجھ

فرمایا: ہر بات میں سمجھ سے کام لینا چاہیے۔ یہی سمجھ دوزخ میں لے جاتی ہے اور یہی سمجھ جنت میں بھی پہنچاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دوری اور نزدیکی بھی اسی سے وابستہ ہے۔ اپنی سمجھ سے ہی ہم کھوٹے اور کھرے کی پہچان کر سکتے ہیں لہذا ہر لحظہ اپنی سوچ اور سمجھ پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ صحیح سمجھ کا تقاضا ہے کہ وہ آخرت کا استحضار رکھے۔

19۔صحیح رہنما

فرمایا: **اے بسا ابلیس آدم روئے ہست** **پس بہر دست نباید داد دست**

طالب حق کے لئے لازم ہے کہ وہ صحیح رہنما کی تلاش کرے۔

فرمایا: اکثر کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں صحیح رہنما نہیں ملتا۔ جن جُبّہ پوشوں اور دین کے دعوے داروں کو دیکھتے ہیں ان میں سے اکثر دھوکہ باز اور بہروپیے ہوتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ صحیح رہنما موجودہ زمانے میں نہیں رہے اس لئے ان کی تلاش بھی بے معنی ہوگئی ہے۔

فرمایا: یہ خیال صحیح نہیں۔ صحیح طلب کی صورت میں صحیح رہنما ضرور ملتا ہے مگر تلاش شرط ہے۔ جیسے صحیح پیاسا اپنی پیاس ٹھنڈے پانی سے ہی بجھاتا ہے نہ کہ شہد یا دوسرے قیمتی مشروبات سے۔ اگر طلب صحیح ہے تو مدعا ضرور حاصل ہوگا مشہور مثل ہے **مَنْ جَدَّوَجَدَ** جو صحیح کوشش کرتا ہے کامیاب ہو جاتا ہے۔ روحانی ترقی کے لئے صحیح رہنما کامیابی کا پہلا زینہ ہے **جوئندہ یابندہ**۔ مگر اس کا انحصار صحیح طلب اور صحیح کوشش پر ہے۔

20۔خدمتِ خلق

اللہ کی رضا اللہ کے احکام کی تعمیل سے حاصل ہوتی ہے نیز رسول خدا ﷺ کا فرمان ہے **تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ** ''اللہ تعالیٰ کے اخلاق اپناؤ''۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر بہت شفقت فرماتا ہے۔ اسی طرح طالب حق کے لئے لازم ہے کہ مخلوق خدا کی ہر حالت میں نہایت احسن طریقے سے خدمت کرتا رہے، اپنے آپ کو ان سے بلند نہ سمجھے اور ان کی خدمت سے ذاتی وقار مقصود نہ ہو بلکہ رضائے الٰہی مقصود ہو۔

عرش سے لے کر فرش تک ہر شے انسانی خدمت میں مصروف ہے لہذا بارگاہِ الٰہی میں عزت کا ذریعہ بھی یہی چیز ہے اور یہی وہ چیز ہے جو انسان کو دیگر حیوانات کی حیات سے ممتاز حیثیت دیتی ہے یعنی بشریت سے ملکیت کو پہنچاتی ہے۔ خدمتِ خلق باعثِ رضائے الٰہی ہے اور قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ انسان کی خدمت میں ہی عظمت ہے۔

21۔قربِ رسول ﷺ اور قربِ خدا

فرمایا: وہی شخص حضور ﷺ کے زیادہ قریب ہوگا جو حضور ﷺ جیسے کام کرے گا اور ان کے اسوۃ حسنہ کا پابند ہوگا۔ اگر حضور ﷺ غارِ حرا میں ہی عبادت کرتے رہتے اور مخلوق خدا کو اللہ کی طرف نہ بلاتے تو کوئی تکلیف پیش نہ آتی مگر حضور پاک ﷺ نے اس راستے میں تمام ایذاؤں کو قبول کیا۔ مگر مخلوقِ خدا کو اللہ کی طرف بلانے سے نہ ٹلے۔ اس لئے اگر حضور پاک ﷺ کا قرب اور اللہ کا قرب مقصود ہو تو وہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جو حضور پاک ﷺ نے خود اختیار کیا۔ لہذا نہایت احسن طریقے سے، نرمی اور شفقت سے، مخلوقِ خدا کو خدا کی طرف بلانا چاہیے یعنی خود خدا سے ملنا اور دوسروں کو خدا سے ملانا اس کا مقصودِ اصلی ہو۔ لوگوں میں رسولی ﷺ دستور العمل قائم کرنے سے خدائی قرب بڑھتا ہے اور روحانی درجات بلند ہوتے ہیں۔

22۔استقامت

فرمایا: اعمالِ دین و دنیا میں ثابت قدم رہنا استقامت ہے سلوک کی اس اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ مومن اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے اس راستے پر ثابت قدمی سے چلے جس راستے پر رسول خدا ﷺ چلے اور ہر اُس چیز سے بچے جس سے سنت رسول ﷺ کی مخالفت لازم آتی ہو۔

فرمایا: استقامت کا سبب شرعی احکام سے کامل واقفیت اور خواہشاتِ نفس کی مخالفت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص شرعی احکام کی واقفیت ہی نہیں رکھتا یا خواہشاتِ نفس کی مخالفت نہیں کرتا تو اسے استقامت حاصل نہیں ہوسکتی۔

فرمایا: امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ استقامت کے تین درجے ہیں۔

1۔ مثل کاغذ:- جو اپنی جگہ پر قائم ہے لیکن ہوا کے ایک خفیف جھونکے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتا ہے۔

2۔ مثل درخت:- جو اپنی جڑوں پر مضبوطی سے قائم ہوا۔ شدید جھونکوں سے بھی صرف اس کا اوپر والا حصہ ادھر ادھر جھکتا ہے مگر جڑیں اپنی جگہ پر مضبوطی سے قائم رہتی ہیں۔

3۔ مثل لوہے کی لاٹھ:- خواہ کیسا ہی شدید طوفان چلے نہ تو اس کا اوپر والا حصہ اور نہ ہی اس کی نچلی جڑ متاثر ہوتی ہے۔ وہ ہر حالت میں قائم رہتا ہے۔

فرمایا: صوفی کی استقامت تیسرے درجے کی ہوتی ہے۔ وہ اپنے عقائد اور اعمال پر لوہے کی لاٹھ کی طرح قائم رہتا ہے۔ شیطانی شکوک وشبہات سے محفوظ رہتا ہے سلوک میں یہی ضروری شرط ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴿الاحقاف: 13﴾

''یقیناً جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے پھر اس پر جم گئے ان کو نہ کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے''

یہی وہ استقامت ہے جو کرامت سے بلند تر ہے۔ **اَلْاِسْتِقَامَتُ فَوْقَ الْکَرَامَتِ**

23۔ ماسویٰ اللہ

فرمایا: ہر وہ چیز جو غیرِ خدا ہے اور جس کی پرستش میں لوگ کوتاہ بینی اور غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں وہ ماسویٰ اللہ کے زمرے میں آتی ہے مثلاً کوئی لات وعزیٰ کی پرستش کرتا ہے، کوئی ہوا و ہوس کی پرستش کرتا ہے، کوئی طلبِ دنیا کا بندہ ہے، کوئی حبِّ جاہ میں گرفتار ہے۔ نفسِ انسانی بھی ماسویٰ اللہ میں شامل ہے۔ غرض ماسویٰ اللہ کی پرستش بہت بڑا حجاب ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ط فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْ م بَعْدِ اللّٰهِ ط اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ

﴿الجاثیة: 23﴾

''بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور باوجود جاننے بوجھنے کے گمراہ ہو رہا ہے تو خدا نے (بھی) اس کو گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اب خدا کے سوا اس کو کون راہ پر لا سکتا ہے بھلا تم کیوں نصیحت نہیں پکڑتے''

فرمایا: ماسویٰ اللہ کو ہر لحہ چھوڑتے جانا چاہیے۔ حتیٰ کہ اپنے مکاشفات کو بھی اصل نہ سمجھے ان میں سے اکثر حجابات ہوتے ہیں جیسے بچے کو کھلونوں سے بہلایا جاتا ہے۔ مکاشفہ کی کسوٹی قرآن وسنت رسول اللہ ﷺ ہے۔

24۔ مراقبہ

فرمایا: مراقبہ کا مدعا اپنے دل کی ماسوئ اللہ سے نگہبانی کرنا ہے۔ نوری حقیقت کو پانے کیلئے دل پر پوری توجہ دینے کو مراقبہ کہا جاتا ہے ہر وقت نگاہ مقصود بالذات پر ہونی چاہیے۔ **قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللهِ تَعَالیٰ** لہٰذا قلبی توجہ ذات پر ہی مزکور رہے۔

25۔ فراستِ مومن

فرمایا: حدیث مبارکہ میں ہے۔

اِتَّقُوْا فِرَاسَتَہ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہ

''مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے''

فراست اللہ کا ایک ایسا نور ہے جس سے مومن دیکھتا ہے اور فائدہ اٹھاتا ہے اس قوت سے مومن دلوں کی باتوں یا لوگوں کے حالات پر اللہ کے نور سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

26۔ چند گذارشات

راقم الحروف نے چند گذارشات پیش کیں جن کے جوابات عنایت فرمائے۔

26.1۔ نماز پڑھنے کا طریقہ

فرمایا: جس وقت جس جگہ پر نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوں اپنی ذات کو مفقود کر کے ذات الٰہی کی طرف متوجہ ہوں الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ان کا مدعا (موضوع) پیش نظر ہو۔ اولیٰ تر یہ ہے کہ مدعا پہلے سامنے آئے اور الفاظ بعد میں۔ یہ بہت اونچا درجہ ہے اور یہی مقبول ہے اور نماز کا خضوع وخشوع ہے۔

26.2۔ درود شریف پڑھنے کا طریقہ

فرمایا: درود شریف حضور علیہ الصلوۃ والسلام کیلئے نہیں پڑھا جاتا۔ یہ تو ذات کیلئے ہے۔ اور اسی کی طرف متوجہ ہو کر پڑھا جائے۔ اور چونکہ ذات الٰہی میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام حاضر ہیں اس لئے ان کے وسیلہ سے پڑھنے والے کا عروج ہوتا ہے۔ یہ تصور کرنا کہ ہم درود شریف حضور پاک ﷺ کی خاطر پڑھ رہے ہیں تا کہ ان کے درجات بلند تر ہوں یا روضہ اطہر کے سامنے کھڑے ہو کر درود شریف پڑھ رہے ہیں یہ باطل ہے۔ ذاتِ الٰہی تو **اقرب من حبل**

الورید ہے۔اس لئے وہ تصور یا خیال درست نہیں مثلاً فرمایا کہ جب باپ کے ساتھ اس کے بچے کے متعلق باتیں کی جائیں تو بچہ اس میں حاضر ہوتا ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ بچہ جسمانی طور پر بھی موجود ہو یا باپ خود اس کا تصور بٹھائے۔ ایسا نسبی صورت میں ممکن ہے تو روحانی صورت میں تو بدرجہ اولیٰ ممکن ہے۔

26.3۔اورادشریف کی تعداد

فرمایا: ہر ورد کے بحساب حروف ابجد عدد لئے جاتے ہیں اور ان حروف کی تعداد میں کچھ پوشیدہ تعداد ملا دی جاتی ہے تو اس تعداد سے اس ورد کا پڑھنا موجبِ قبولیت دعا ہوتا ہے۔اسماءِ ظواہر (صفاتی) سے اس اسم کے مدعا کے مطابق دعا قبول ہوتی ہے کیونکہ ہر اسمِ ظاہر کسی نہ کسی صفت کے اظہار کیلئے ہے۔

26.4۔مجلس میں پڑھنے کے لئے

فرمایا: ہمارے سلسلہ کے اورادشریف کی تعداد اس طرح مقرر کی گئی ہے کہ حروفِ ابجد کے اعداد میں کچھ اعداد (جو پوشیدہ رکھے گئے ہیں) ایزاد کئے گئے ہیں تا کہ صحیح تعلق والا شخص خواہ مشرق میں ہو یا خواہ مغرب میں اسے ان کا فائدہ پہنچتا رہے۔چنانچہ سلسلہ سے محبت رکھنے والوں کی اس میں رعایت رکھی گئی ہے۔

البتہ مجالس ذکر میں صاحبِ مجلس اس مقرر کردہ تعداد میں حسبِ ضرورت کمی وبیشی کرسکتا ہے۔ اورادِ نظیریہ کی ایسی مجالس کا انعقاد باعثِ برکت وثواب ہے۔

27۔خواہش نفس

فرمایا: کسی کام کو اپنی خواہش سے نہ کرے نہ کھانا اپنی خواہش سے کھائے۔یہاں تک کہ عبادت بھی اپنے نفس کی خواہش سے نہ ہو۔انسانی زندگیوں اور سلطنتوں کو تباہ کرنے والی صرف نفس کی خواہشات ہیں۔نفس امّارہ بہت چالاک اور عیار ہوتا ہے اور شیطان کا ساتھی ہوتا ہے۔اس کی خواہشوں پر ہر وقت نگرانی رکھنی چاہیے۔ہر کام اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے کیا جائے۔ہر کام شروع کرتے وقت یہی نیت ہو اور اسی نیت کا استحضار رہے۔

28۔نسبت رسولﷺ کا علم

فرمایا: صوفی کے پاس وہ علم ہے جس کی وجہ سے وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا۔کیونکہ اس کی قوت اپنی نہیں ہوتی وہ مالک کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔وہ کتاب وسنت کا علم ہے جو نسبت رسولﷺ کے علم کی بنیاد ہے۔

29۔صاحبِ حال ہونا

فرمایا: صاحب حال ہونا چاہیے جو پڑھا جائے اس سے حال کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ بہت سے وظائف اور ختم بغیر حالی کیفیت پڑھنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ البتہ کچھ نہ پڑھنے کی بجائے ذکر قلبی میں مشغولیت بہت بہتر ہے مگر قرب ذاتی کے حصول کا معیار زیادہ وظیفوں پر نہیں بلکہ حال کی کیفیت اور اخلاص پر منحصر ہے۔

30۔کتاب کی پہچان

فرمایا: کتابوں میں بہت کچھ لکھا ہوتا ہے مگر ہر لکھی ہوئی بات درست نہیں ہوتی۔ لہذا کھرے اور کھوٹے کی پہچان اپنی فراست سے کرنی چاہیے۔ حدیث شریف میں ہے۔

اِتَّقُوْا فِرَاسَتَه الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰه

''مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے''

جب مومن کو یہ فراست حاصل ہو جاتی ہے تو اس کی روشنی میں وہ ہر بات کے کھرے اور کھوٹے کی تمیز کر سکتا ہے۔

31۔اسلامی سلطنت (نصرتِ اسلام) کا قیام

فرمایا: مانسہرہ سے آگے گلگت اور ہنزہ تک تقریباً دو سو میل کا علاقہ ہے۔ اس علاقے میں اقوام نند ہاڑ، سنکڑی، آلائی اور کوہستان کے وسیع علاقے شامل ہیں۔ ان میں میدان بھی ہیں، پہاڑ زیادہ ہیں اور جنگلات کی کثرت ہے۔ اس علاقہ میں آزاد اسلامی سلطنت قائم کرنے کا انتظام کیا گیا۔

ہمارا مدعا یہ تھا کہ اس علاقہ کی اقوام میں تنظیم کی تکمیل کی جائے تا کہ اسلام کے لئے ایک مضبوط مرکز قائم کیا جائے اور اسے جہادِ اسلامی کا مرکز بنایا جائے۔ اسی پروگرام کے ماتحت قلعہ میگزین کی بھی تعمیر کی گئی۔ تمام اقوام بیعتِ سلطانی میں داخل ہو چکی تھیں اور معاہدے تحریری بھی ہو چکے تھے اور فوجی تنظیم بھی کر لی گئی تھی۔ سامانِ جنگ وافر مقدار میں موجود تھا۔ اسلامی تعلیم و تربیت کا نظام بھی جاری کر دیا گیا تھا۔ اسلامی مرکز کے لئے یہ جائے وقوع ہر خوبی رکھتی تھی۔ اطراف میں قریب کابل اور دریائے پامون تک آزاد قبائل ہیں جو بوقت ضرورت ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں۔ جن کے ساتھ مراسم اور اس اسلامی سلطنت کی توسیع کے وسیع امکانات تھے اور روسی سلطنت بھی قریب تھی۔ لہٰذا انگریزوں کے خلاف جہاد جاری کرنے کے لئے یہ موزوں ترین جگہ تھی۔ جب یہ تیاری مکمل ہو گئی تو نشانِ

بادشاہت (جھنڈا) کی اجازت کی خاطر میں موہڑہ شریف جناب پیر صاحب (والدم) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تاکہ یہ جھنڈا اپنے قلعہ پر جو ہمارا دارالحکومت تھا وہاں لگایا جائے۔ جب پیر صاحب (والدم) کی خدمت میں پیش ہوا تو انہوں نے بڑی متاثر کن گفتگو فرمائی اور فرمایا کہ ہمیشہ سے میری امید یہی رہی ہے کہ میرا یہ قابل اور دنیا سے بہتر بیٹا اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی لئے عطا کیا ہے کہ میرے پیغام (اصلی پروگرام) مخلوقِ خدا کی خدمت کو جاری رکھے گا۔ کیونکہ یہ چیز دنیا کی قیادت اور بادشاہت سے کہیں بہتر ہے۔ اسی ضمن میں انہوں نے اَور نصائح بھی فرمائیں۔ انہی دنوں چند واقعات ایسے بھی پیش آئے کہ میں نے 1935ء میں بادشاہت کو از خود ترک کر دیا اور موہڑہ شریف میں قیام کیا۔ اس علاقے کے لوگوں کے متواتر جرگے آتے تھے کہ آپ ہمارے بادشاہ موجود ہیں ہم آپ کے زیرِ حکم جہاد کریں گے۔ میں اگلے سال سرہند شریف چلا گیا۔ وہاں سے واپسی پر لاہور میں قیام کے دوران خواب دیکھا کہ ایک شخص زور سے منادی کر رہا ہے ''حضرت شیر شاہ غازیؒ نے انگریز کی حکومت کو فنا کر دیا'' تین دفعہ پکارا۔ اس کے بعد میں جاگ گیا اور میں نے اس خواب کو لکھ لیا۔ یہ 1936ء کا واقعہ ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے 1936ء کے بعد کے واقعات نے اس خواب کی تصدیق کر دی۔

32۔ قائداعظم سے ملاقات

اعلیٰ حضرت رحمتہ اللہ علیہ نے جولائی 1939ء سے مارچ 1940ء تک ہندوستان کے مختلف مقامات اور مسلم ریاستوں بالخصوص بھوپال اور حیدرآباد (دکن) کا اہم دورہ کیا اور جنوبی ہند میں میسور، مدراس، پانڈیچری اور ترچنا پلی تک تشریف لے گئے۔ اعلیٰ حضرتؒ اپنی خاص مجالس میں اس سفر کے حالات بیان فرماتے تھے۔ چنانچہ چند چیدہ چیدہ واقعات کتاب ہذا میں درج بھی کئے گئے ہیں۔ واپسی سفر میں جنوری 1940ء میں دہلی تشریف لائے اور پھاٹک حبش خان میں نذیریہ لائبریری کے مہمان خانہ میں قیام فرمایا۔ یہ جگہ جامع مسجد فتح پوری کے قریب واقع ہے۔ انہی ایام میں نئی دہلی میں حضرت قائداعظم سے بھی ایک اہم اور خصوصی ملاقات کی۔ مسلم لیگ لاہور کے تاریخی اجلاس کا اعلان ہو چکا تھا اور ہندو اخبارات نے قائداعظم کی مخالفت میں آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔

ہندوستان کے سارے سفر کے دوران اعلیٰ حضرتؒ کے ایک خادم خاص صوفی غلام محمد صاحب انکی خدمت میں حاضر رہے اور دل و جان سے خدمات انجام بجالاتے رہے۔ چنانچہ راقم الحروف نے صوفی غلام محمد صاحب سے اس سارے سفر کے حالات سنے اور قائداعظم سے ملاقات کے متعلق خصوصی طور پر تفصیلی حقائق معلوم کئے۔ جو انہوں نے بیان کئے۔

دہلی کے قیام کے دوران فروری 1940ء میں ایک روز صوفی صاحب کو حکم فرمایا کہ قائداعظم کی کوٹھی پر

ٹیلیفون کر کے ان سے ملاقات کا وقت حاصل کرو۔ چنانچہ صوفی صاحب نے تقریباً 9 بجے صبح ٹیلیفون کیا تو ان کی ہمشیرہ صاحبہ (مس جناح) سے بات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ قائداعظم کا معمول ہے کہ وہ چار بجے شام چائے پیتے ہیں اور عموماً اسی وقت ملاقات بھی کرتے ہیں۔ آج میں نے ابھی تک کسی ملاقاتی کو وقت نہیں دیا۔ اگر حضرت پیر صاحبؒ تشریف لاسکیں تو بڑی خوشی ہوگی۔ مجھے جلد مطلع کردیں تاکہ میں ملاقات کا انتظام کرسکوں۔ چنانچہ صوفی صاحب نے اعلیٰ حضرتؒ سے اجازت لیکر قبولیت کی اطلاع مس جناح صاحبہ کو کردی۔ وہ بہت خوش ہوئیں اور بتایا کہ انہوں نے حضرت قائداعظم سے بھی ذکر کردیا ہے اور وہ بھی حضرت پیر صاحبؒ کی ملاقات کے منتظر ہیں۔

حسبِ فرمان صوفی صاحب تین بجے ایک اعلیٰ قسم کا تانگہ لے آئے اور چار بجے سے چند منٹ قبل قائداعظم کی رہائش گاہ (کوٹھی نمبر 10 اورنگزیب روڈ۔ نئی دہلی) پر پہنچ گئے۔ مس جناح صاحبہ نے اعلیٰ حضرتؒ کا استقبال کیا اور برآمدے میں دروازہ حضرت قائداعظمؒ نے خود کھولا اور دونوں ڈرائنگ روم میں تشریف فرما ہوگئے اور ابتدائی ملاقات شروع ہوئی۔

چونکہ میز پر چائے تیار تھی تھوڑی دیر کے بعد دونوں صاحبان میز پر آمنے سامنے تشریف فرما ہوئے۔ دورانِ گفتگو اعلیٰ حضرتؒ نے دریافت فرمایا کیا آپ کی موجودہ تحریک کا مقصد ہندوستان میں ایک علیٰحدہ آزاد اسلامی مملکت کا قیام کرنا ہے۔ اس کا اصلی مدعا کیا ہے اور آپ اس پر کیوں مُصِر ہیں؟ کیا آپ اس سے ذاتی شہرت چاہتے ہیں؟ یا مال و دولت کی تمنا ہے؟ یا نئی مملکت کے سربراہ بننے کی آرزو ہے؟ قائداعظمؒ نے فرمایا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری کم و بیش ساری سیاسی زندگی ہندو لیڈران کے ساتھ گزری ہے اور میں نے ہندو مسلم اتحاد کی لگاتار کوشش کی ہے میری یہی تمنا تھی کہ ہندو مسلم متفقہ طور پر کوشش کریں تو انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرسکیں گے اور باہمی میل ملاپ سے ایک آزاد قوم کی حیثیت سے رہ سکیں گے۔ مگر میری زندگی کا تلخ ترین تجربہ یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس جس کو ہندو لیڈران ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کی واحد نمائندہ تنظیم قرار دیتے ہیں وہ محض دھوکا ہے حقیقتاً یہ ایک ہندو تنظیم ہے اور ان کا منصوبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو موجودہ وقت میں اپنا ہمنوا ظاہر کر کے انگریزوں سے آزادی حاصل کرلیں مگر اس کے بعد ہندو آبادی کی چار گنا زیادتی کی بنیاد پر مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے اپنے زیر اثر اور غلام بنائے رکھیں۔ کانگرس کے علاوہ ہندوؤں اور غیر مسلموں کی بہت سی تنظیمیں ان کی ہمنوا بن چکی ہیں اور سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی بھی بہت سی تنظیمیں مثلاً مجلسِ احرار اور مجلسِ مومنین وغیرہ، ان سے ملاپ کر رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کیلئے ان کی تاریخ کا یہ اہم ترین اور فیصلہ کن مرحلہ ہے۔ اسی مرحلہ پر یہ فیصلہ ہوجائے گا کہ ہندوستان میں آئندہ کے لئے مسلمان ہندوؤں کے غلام بن کر رہیں گے یا وہ اپنی آزاد مملکت قائم کرسکیں گے۔

مجھے یقین کامل ہے کہ اس نہایت اہم مرحلہ پر اگر مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو جائے اور متفقہ طور پر مسلم لیگ کی تنظیم کو مضبوط اور متحد کر لیا جائے تو ہم ہندوستان میں ایک آزاد اسلامی مملکت قائم کر سکتے ہیں اور اس میں ہم اسلامی نظام قائم کر سکتے ہیں۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے نہ تو ذاتی شہرت کی ضرورت ہے نہ ہی مال و دولت کی تمنا ہے اور نہ ہی سربراہِ مملکت بننے کی آرزو ہے۔ البتہ ایک ہی تڑپ اور لگن ہے کہ اس نازک اور اہم موڑ پر میں مسلمانانِ ہند کی کچھ خدمت کر سکوں اور انہیں انگریز اور ہندو کی غلامی سے آزاد کرا سکوں۔ اس مدعا کے لئے میں نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے اور اسے حاصل کرنے کے لئے میں اپنی بہترین کوششیں جاری رکھوں گا۔ انشاءاللہ۔

قائداعظم کی اس گفتگو سے اعلیٰ حضرتؒ بہت متاثر ہوئے اور اسی وقت کھڑے ہو گئے۔ قائداعظم بھی کھڑے ہو گئے۔ اعلیٰ حضرتؒ نے پرجوش مصافحہ کیا اور فرمایا: ''میں آپ کو اپنے خیال کی اس مضبوطی پر مبارک باد دیتا ہوں۔ انگریز اور ہندو دونوں سے آپ کو سخت مقابلہ درپیش ہے۔ لیکن آپ اپنے اس خیال پر ثابت قدمی سے قائم رہیں اور اس میں ہرگز کوئی فرق نہ آنے دیں۔ آپ اس ارادے میں بفضلہٖ تعالیٰ ضرور کامیاب ہوں گے۔ انگریز اور ہندو کو بھی آخر کار یہی فیصلہ تسلیم کرنا پڑے گا اور انشاءاللہ ایک آزاد اسلامی مملکت قائم ہو گی۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔''

اعلیٰ حضرتؒ نے رخصت چاہی۔ قائداعظم اور مس جناح صاحبہ دونوں نے بڑے تپاک اور احترام سے رخصت کیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ تحریک پاکستان 1940ء سے 1947ء تک کے سات سالوں کے عرصہ میں نہایت نازک مراحل سے گزری اور قائداعظم کے سامنے بے شمار دشواریاں پیش آئیں مگر وہ باوجود اپنی نحیف اور کمزور صحت کے اپنے بنیادی ارادے پر چٹان کی طرح ڈٹے رہے اور ان کے اس غیر متزلزل ارادے میں کوئی فرق نہ آیا۔

چنانچہ تمام انگریز اور ہندو حریفوں نے بھی اس حقیقت کو مجبوراً تسلیم کیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انگریز اور ہندو کی انتہائی مخالفت کے باوجود ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک آزاد اسلامی مملکت (پاکستان) قائم ہو گئی۔

33 قوموں کی آزمائش

فرمایا: قرآن حکیم میں ہے۔

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ o اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ o الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِیْ

الْبِلَادِ o وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُو الصَّخْرَ بِالْوَادِ o وَفِرْعَوْنَ ذِى الْاَوْتَادِ o الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ o فَاَكْثَرُوا فِيْهَا الْفَسَادَ o فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ o اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿الفجر :14-6﴾

''کیا تم نے نہ دیکھا تمہارے رب نے عاد کے ساتھ کیسا کیا وہ ارم حد سے زیادہ طول والے کہ ان جیسا شہروں میں پیدا نہیں ہوئے تھے اور ثمود جنہوں نے وادی میں پتھر کی چٹانیں کاٹیں اور فرعون کو جو خیمے اور میخیں رکھتا تھا جنہوں نے شہروں میں سرکشی کی پھر ان میں بہت فساد پھیلایا تو ان پر تمہارے رب نے عذاب کا کوڑا ابقوت مارا بیشک تمہارے رب کی نظر سے کچھ غائب نہیں''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ پچھلی قوموں کے حالات کا مطالعہ کرو۔ قوموں کی آزمائش ہمیشہ جاری رہی ہے۔ ان کو ان کی بداعمالیوں کے نتیجہ کی سزا ملتی رہی ہے۔ عاد، ثمود، قوم نوح، اور قوم فرعون اور دوسری قوموں کا ذکر قرآن مجید میں تکرار کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ہر قوم کو مہلت دی جاتی ہے مگر جب وہ سرکشی پر اتر آئے اور اپنے رب کے رسول کی بات نہ مانے تو ان کو سختی سے پکڑا گیا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں وارد ہے۔

فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ﴿الحاقة :10﴾

''انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغمبر کی نافرمانی کی تو خدا نے بھی ان کو بڑا سخت پکڑا''

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو پاکستان انعام کیا ہے جس کے لئے انہوں نے کوئی جنگ نہیں لڑی۔ قیام پاکستان کے وقت بحیثیت قوم ہمارا ایک پختہ عہد ہے۔ یہ عہد ہم نے تحریک آزادی کے دوران کیا تھا کہ ہم پاکستان بنائیں گے اور اس پاکستان میں قانون فقط اللہ تعالیٰ کا ہوگا۔ اپنی زندگیوں کو تابع فرمانِ رسول ﷺ بنا کر تمام دنیا کے لئے اسلامی زندگی اور اسلامی اخلاق واقدار کا نمونہ پیش کریں گے۔

پاکستان نعمت خداداد ہے ہمیں خوب یاد رکھنا چاہیے۔ اگر ہم نے اس کی زندگی اور اس کے معاشرے کا رشتہ قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ سے مستحکم نہ کیا تو ہم اس نعمت کے تشکر کا حق ادا کرنے سے قاصر رہیں گے۔ ہمیں سلبِ نعمت کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔